سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تو عام طور سے مشہور ہی، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت کے اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہو، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہی، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہی کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہی، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہی،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ستے، تقطیع خورد صہ و ٹے، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، وللعہ، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں سے، و سے، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ، وللعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ)

جلد ۴۲ | ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء | عدد ۵

مضامین

شذرات

علمی حلقوں میں یہ خبر غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب جو قلمی کتابوں کے بڑے عاشق تھے چوالیس برس کی عمر میں ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے چل بسے، مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، اور ان کے کتبخانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب مصر و شام و عرب و قسطنطنیہ کے کتبخانوں میں ان کے کاتب اور ناسخ نئی قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین، اور طریق سلف کے متبع، اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنے انوار رحمت کی بارش فرمائے،

مدراس عمرآباد میں حاجی عمر (روشن کمپنی) کا خاندان ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، حاجی صاحب امرتسر کے علمائے غزنویہ کے فیض سے مستفیض، اور توحید و سنت کے متبع تھے، کامیاب تاجر تھے، اپنے ہی نام سے شمالی ارکاٹ میں ایک زمین خرید کر عمرآباد نام ایک مقام آباد کیا تھا اور وہاں ایک بڑے دینی عربی مدرسہ دارالسلام کی بنیاد رکھی تھی، چند سال ہوئے کہ انھوں نے وفات پائی اور تین صالح اولاد اپنی یادگار چھوڑیں، اسمٰعیل، ابراہیم اور اسحاق، سب سے بڑے اسمٰعیل تو کاروبار کے نگران ہیں، اور ابراہیم نے جو منجھلے تھے مدرسہ کی دیکھ بھال اس کے قیام و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا، ابھی پچھلے سال جوہری طنطاوی کی تفسیر کا اردو ترجمہ ایک ہزار روپیہ کے صرف سے مطبع معارف میں چھپوایا تھا، مدرسہ کے لئے کتب خانہ تنہا اپنی ذات سے کتابیں خرید کر فراہم کیا تھا، اس کے لئے ایک

عمارت بھی بنوائی تھی، افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گیا، یعنی ۳۰ رجب ۱۳۵۷ھ کو اس دنیائے ناپائدار کو الوداع کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ،

ہمارے عربی مدرسوں کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی ہے، ہمارے نئے تعلیم یافتوں کے پاس اول تو اپنے اسرافات سے کچھ بچتا نہیں، دوسرے وہ ان مدرسوں کی ضرورت کے قائل بھی نہیں، ابتک سہارا اسلامی ریاستوں کا تھا تو وہاں اب ایک تو ملکی و غیر ملکی کا سوال پیدا ہو گیا ہے، دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کی شورش سے وہاں کے ارباب اقتدار اتنے سہمے ہیں کہ دین و مذہب اور اسلام کے نام سے کوئی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، ان مدرسوں کا سب سے بڑا سہارا مسلمان تاجر تھے، مگر برا ہو نشلزم کا برا ہو کہ اس نے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اب ہر جگہ یہ سوال ہے کہ صوبے سے باہر کیوں دیا جائے، رہ گئے عوام وہ دیتے ہیں، اور دے سکتے ہیں، مگر ان سے آنہ آنہ جمع کرنا خود ایک مستقل کام ہے، حکومت وقت اول تو دینے ہی سے رہی، اور جسکو دیتی بھی ہے اس سے پوچھئے کہ وہ کس طرح لے رہا ہے، یہ ہے اس قوم کے عربی و مذہبی مدرسوں کا حال جو اپنے دین و ملت اور اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی تباہی کے درد سے بیتاب ہے،

ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ ان مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہو گی اس سے بہت بڑھ کر ان کی ضرورت ہو گی، وہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہونگے، لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ارباب اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہونگے اور ابھی دیوانے ملا آج کی طرح کل بھی ہشیار رہونگے اور رہینگے، اس لئے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے،

ان عربی مدرسون کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے، کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے، اور اسکی اگلی نسلیں کچھ اور اونچی ہوتی ہیں، اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی،

ان مدرسوں کے نقائص سے بھی واقفیت ہے، لیکن ان نقائص سے انکار ان مدرسوں کے چلانے والوں کو بھی نہ رہا، وہ پرانا ڈھچر بدلنا بھی چاہتے ہیں، مگر اس کے لئے خرچ اور مصارف ہیں، جن کا سامان ہماری بے توجہی سے نہیں ہوتا، بڑے عربی مدرسون میں سائنس پڑھانے کے لئے سب تیار ہیں، مگر کئی ہزار کا سامان اور سوسوا سو کا سائنس ماسٹر کہاں سے آئے، اور دوسرے تغیرات کے لئے بھی احساس ہے، مگر قوم کی بے حسی کا رونا ہر جگہ ہے،

نصاب کی اصلاح کا خیال بھی عربی مدرسوں میں اب عام ہے، ضروری اور غیر ضروری علوم پر بھی نظر ہے، تنقید کے شور وغل سے پرانے علوم کی طرف سے توجہ تو ہٹ گئی مگر نئے علوم کا سامان نہ ہو سکا، غرض یہ بھی گیا وہ بھی گیا، اب قدیم منطق و فلسفہ اور قدیم ہیئت و ریاضیات کا شوق نہیں رہا، اور نئی منطق، نیا فلسفہ، نئی ہیئت، اور نئے ریاضیات و طبعیات کی تعلیم بھی نہ دی جا سکی، نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارا مولوی اُن سے بھی عاری نکل رہا ہے اور ان سے بھی! مگر کیون؟

مقالات

سیرت سید رشید رضاؒ

از

مولینا مسعود عالم ندوی کٹیلاگر اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ، سابق مدیر الضیاء

سید جمال الدین افغانی کے عقیدت کیش محمد عبدہٗ کے قوت بازو، گذشتہ پنجاہ سالہ اسلامی تحریکوں کے سرگرم حامی قرآن کریم کی تفسیر اور بیسیون کتابون کے مصنف و مؤلف، عربی کے بے مثل انشا پرداز اور خطیب اسلامی دنیا، امام سید رشید رضا کو مختلف حیثیتون سے جانتی ہے، ان کے کا نامون سے واقف ہے، عصر حاضر کے گنے چنے مصلحین امت مین ان کا شمار ہوتا ہے لیکن کم ہین، جو ان کی ابتدائی زاہدانہ زندگی علمی جلالت قدر اور سیاسی عظمت کا صحیح علم رکھتے ہین، اور ان کی بے نفسی انسانیت اخلاص، مروّت اور قابل رشک خاکساری کا صحیح تصور بھی کر سکتے ہین،

اسلامی ہند کے اہل علم سید رشید رضا مرحوم کو ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کے صدر اور مفسر قرآن کی حیثیت سے ضرور جانتے ہین، اور ان کی قدر کرتی ہیں لیکن عربی زبان و ادب کی کساد بازاری کے باعث ان کی ادبی منزلت کا صحیح اندازہ یہان نہین ہو سکتا تھا، حجاز کی موتمر اسلامی کے باعث ان کا سیاسی کردار بھی اب تک صحیح رنگ مین نہیں پیش ہو سکا ہے، مصر اور دوسرے اسلامی ملکون

---

[1] "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" مولفہ امیر البیان حضرت علامہ امیر شکیب ارسلان مدظلہ تقطیع متوسط کاغذ اعلیٰ طباعت نفیس حجم ۸۳۲ صفحے، مطبع ابن زیدون دمشق، شائع شدہ ۱۳۵۶ھ، قیمت درج نہیں،

مین عقیدتمندون اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والون کی کمی نہین، لیکن ان کی وفات پر جس سردمہری کے ساتھ ماتم ہوا، اس سے یہ خوف ہوتا تھا، کہ شاید ملت اسلامیہ اب تک اپنے محسنون کو پہچاننے کے قابل بھی نہین ہوسکی ہے، مصر، جہان آئے دن لیڈرون اور شاعرون کی برسی (حفلات التابین) منائی جاتی ہے، وہان اس جلیل القدر امام کی یادگار مین ایک آدھ اچھا خاصہ جلسہ بھی نہین ہوسکا، شوقی اور حافظ کی قبرون پر قصیدے پڑھے جاتے ہین، عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہین، حفلات التابین مین دور اور نزدیک تمام عربی علاقون کے نمایندے آکر شریک ہوتے ہین، اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ادبی جشن (مہرجان) منائے جاتے ہین، لیکن کتاب وسنت کے خادم کی قسمت مین سردمہری اور تغافل کے سوا کچھ نہ تھا، شاید یہ بھی قدرت کا امتحان ہو، جب مصر کا یہ حال ہے تو پھر ہندوستان اور دوسرے دور دراز کے خطون کا گلہ کیون کیا جائے،؟

امام سید رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳؍ جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ شام کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا، فوری طور پر معمولی سا ماتم ہوا، المنار کے بقا اور اجرا کی کوششیں ہوئین، عربی ممالک کی روش کے مطابق حفلۃ تابین کا اعلان ہوا، پھر خاموشی اور سکوت! اہل مصر کی سیاسی مصروفیتین اس قدر بڑھی ہوئی ہین کہ کسی ٹھوس اور سنجیدہ علمی کام کی طرف توجہ کرنیکی شاید زیادہ فرصت نہین، اسی طرح دو تین سال گذر گئے، خیال تھا، کہ اب امت کے دلون سے مرحوم کی یاد فراموش ہوچکی،

ان حالات مین اگر امام مرحوم کے کارنامون کو زندہ رکھنے، اور ان کی زندگی کو اُجاگر کرنے کی جو کوشش کی جائے، وہ مستحق صد آفرین وستایش ہو، سید رشید رضا مرحوم اس لحاظ سے یقینی خوش نصیب ہین کہ ان کی سوانح نگاری کے لئے مشرق کے قائد اعظم عربی کے معجز نگار انشا پرداز اور دنیاے اسلام کے جلیل القدر مصلح کا انتخاب عمل مین آیا، دیر آید درست آید سنا کرتے تھے اس موقع پر یہ مقولہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا، سوانح نگار امیر البیان امیر شکیب ارسلان اسلامی دنیا مین تعارف سے بے نیاز ہین، جو قلم

پچپن سال سے مسلسل اسلام اور مسلمانون کی خدمت مین مصروف عمل ہو، جس ہمہ گیر شخصیت نے طرابلس کے میدان جہاد مین اپنے "صاحب سیف وقلم" ہونے کی دھاک بٹھا دی ہو، جو بیس سال سے مجلس اقوام کے مرکز مین بین الاقوامی سیاسیات کی گتھیان سلجھا رہا ہو، اس کی منقبت اس ہیچ میرز کے بس سے باہر ہے، اور اگر کوشش بھی کیجائے، تو یہ مختصر صحبت کافی نہین ہوسکتی،

امام سید رشید رضا مرحوم کی سیرت اس پر امیر البیان کا گہربار قلم، ان دونون حیثیتون سے "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، مصنف اور صاحب سیرت، دونون اس عہد کے چند ممتاز افراد مین ہین، اسلامی دنیا مین تو بلاشک وشبہہ یہ دونون شخصیتیں سب پر بھاری ہین، عربی سیاسیات مین بھی دونون کا مرتبہ بہت بلند ہے، عربی ادب مین اگر امیر البیان "ستر سال" کے بادشاہ ہین، تو سید رشید کا زور قلم بھی اپنی نظیر نہین پیش کرسکتا، علوم مین اگر مرحوم قرآن کریم، حدیث، رجال، فقہ، بلاغت، اور تمام دینی علوم کے امام تھے، تو تاریخ، جغرافیہ، بین الاقوامی سیاسیات، ادب وشعر، لغت مین امیر البیان کا پلہ بھاری ہے، سیاسیات اور عملی دنیا مین دونون کا طریقہ نظر وفکر تقریباً ایک رہا ہے، دونون سید جمال الدین کے خوشہ چین تھے، دونون کو شیخ محمد عبدہ کی شاگردی پر فخر رہا، وحدت اسلامیہ، اتحاد عرب، اور نئی مخالف اسلام تحریکوں کی دشمنی مین بھی دونون ہم خیال تھے، اگر کچھ اختلاف تھا، تو ترکوں کے مسئلہ مین، وہ بھی آخری انقلاب اور نوبہ نو تبدیلیون کے بعد کمالی حکومت کے بارے مین دونون کی رائین ایک حد تک متحد ہوچکی تھین،

کتاب کا اجمالی خاکہ

یہ کتاب ظاہر مین صرف سید رشید مرحوم کی سیرت اور حالات کا مجموعہ ہے، لیکن قدرتی طور پر اس کے دامن مین گذشتہ چالیس سالہ تحریکین سمٹ آئی ہین، سینکڑون ادبی ولغوی بحثین مختلف علمی ودینی نکتے دوران تحریر مین آگئے ہین، کتاب کا آغاز مؤلف کے ایک مختصر مقدمہ سے ہوتا ہے، جس مین ضرورت تالیف اور صاحب سیرت کے کارنامون اور تالیفات کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے،

مقدمہ کے بعد مؤلف نے (ماقلتہ عن السید رشید فی حیاتہ) کے عنوان سے اپنی وہ طویل تحریر نقل کی ہے، جو اس نے صاحب سیرت کے متعلق ان کی زندگی ہی میں (۱۳۲۲ھ) سپرد قلم کی تھی، اس ٹکڑے سے امیر کی فراخ دلی اور مردم شناسی کا پتہ چلتا ہے، اسلامی ہند میں جہاں بڑون کا ادب اور علم و فضل کا اعتراف اب مفقود ہو رہا ہے، شاید یہ سطرین دلچسپی سے پڑھی جائین،

"........ المنار کی جلدین صحیح معنون مین اسلامی علوم کی انسائیکلوپیڈیا کہی جاسکتی ہین، جن سے اس عہد مین کوئی مسلمان بے نیاز نہین ہو سکتا، اسی طرح ان کی تفسیر جس کے ذریعہ قدرت نے اپنے اسرار و حقائق کی گرہ کشائی کا کام لیا ہے، ان کا بے مثال کارنامہ ہے جس نے انھین مشاہیر ائمۂ اسلام کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے، اسی طرح دفاع اسلام، صحیح عقائد کی تبلیغ، ملاحدہ اور غیر مسلمین کے اعتراضات کی تردید اور ان کی دوسری خدمات ایسی ہیں، جن کی گرد کو اس زمانہ کا کوئی عالم نہیں پہنچ سکتا، اور نہ اس بلند مقام تک پہونچنے کا کوئی تصور کر سکتا ہے،........ ہماری اس توصیف میں کوئی مبالغہ نہیں، اور نہ اس کا یہ کوئی موقع ہے، ہمارا مسلک یہ ہے، کہ کسی کی حق تلفی نہ کرین، اور یہی حکم خداوندی ہے، اور نہ ہمارے نزدیک معاصرت قدر شناسی میں حارج ہے، بلکہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ لوگون کی خوبیان، زندگی و موت ہر حال مین ایک کسوٹی پر پرکھی جائین"، (صفحہ ۱۰-۱۶)

اس کے بعد السید رشید رضا کی ترجمہ نفسہ" کے عنوان سے مرحوم کی خود نوشت سوانحعمری ہے جو تقریباً سو اسو (۲۰-۱۴۲) صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، یہ پوری آپ بیتی "المنار والازہر" میں شائع ہو چکی ہے، جا بجا امیر کے حواشی ہین، جن سے اشارات اور تلمیحات کی توضیح ہوتی گئی ہے، امیر البیان کے

ملہ ملاحظہ ہو، حاضر العالم الاسلامی طبع جدید، جلد اول ص۲۹۳ - ص۳۰۶، ؁۵۲ طوالت کے خوف سے اصل عربی نہیں دی گئی، ترجمہ مین حتی المقدور اصل سے مطابقت کی پوری کوشش کی گئی ہے،

حواشی کے بعد یہ آپ بیتی بالکل ایک نئی چیز ہو گئی ہے، اور گذشتہ نصف صدی کے بعض اسرار اور علماء کی باہمی کشاکش نیز بعض سیاسی معاملات اس نئے آئینہ مین کچھ اور نظر آتے ہین، ہم آیندہ صفحات مین مرحوم کی آپ بیتی کا خلاصہ درج کرین گے،

خود نوشت سوانح حیات کے بعد تاریخ علاقتی مع السید رشید رحمہ اللہ (ص۱۴۴ - ص۱۶۵) کے تحت مؤلف نے اپنے اور مرحوم کے تعلقات کا محبت آمیز انداز مین تذکرہ کیا ہے، اس سلسلہ میں ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء سے ۱۳۵۴ھ تک کے مختلف بھولے ہوئے تذکرے، بیروت میں شیخ محمد عبدہ کی مجلسین سید جمال الدینؒ سے مرحوم کی عقیدت، سفر مصر کا قصد، اور بیسیوں ایسی چیزین اس ضمن مین آگئی ہین، جو اگر امیر البیان کے قلم پر نہ آجاتیں، تو تازہ واردانِ بساط ہوائے دل" کو ان کا علم بھی نہ ہوتا،

مؤلف اور مرحوم کے تعلقات کی تفصیل کے بعد، ایک فصل میں مرحوم اور شیخ محمد عبدہ کے تعلقات پر گفتگو کی گئی ہے، کتاب کا یہ حصہ (۱۹۶-۱۸۰) مرحوم کی مشہور تالیف تاریخ الاستاذ الامام جلد اول سے ماخوذ ہے،

کتاب کا نام ہی "اخاء اربعین سنۃ" ہے، اس چہل سالہ دوستی کی مناسبت سے وہ تمام مقالات تبصرے اور سفر کی روداد ین کتاب میں درج کر دی گئی ہین، جو المنار مین مرحوم یا امیر البیان کے قلم سے شائع ہوئی تھین، اور ان کا ان دونون کی زندگیون سے کوئی تعلق تھا، یہ حصہ تقریباً ستر صفحات (۱۸۱-۲۵۱) پر مشتمل ہے، اس مین حسب ذیل مضامین آسکے ہین،

۱- اداء الامیر شکیب لفریضۃ الحج، امیر البیان ۱۳۴۵ھ مین زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اس سلسلہ مین سید رشید مرحوم نے المنار، صفر ۱۳۴۳ھ مین ایک مفید اور دلنواز شذرہ لکھا تھا،

۲- وفد الصلح والسلام ۱۳۵۳ھ مین امام یحیٰی اور سلطان ابن سعود کے درمیان صلح

امن کا پیام لے کر جو وفد گیا تھا، اس کے ایک رکن امیر شکیب بھی تھے اس مضمون میں انکی کوششوں کا ذکر ہے،

۳- حوادث سوریة فی سنوات الحروب، جنگ عظیم کے دوران میں عربی ممالک کی سیاست عجب ڈانواں ڈول تھی، سید رشید مرحوم عربی تحریک کے قائد تھے اور امیر ترکوں کے حامی، اس خیال اور نقطہ نظر کے اختلاف سے تعلقات میں بھی کشیدگی آگئی تھی، امیر شکیب پر عرب غداری کا الزام لگاتے اور امیر دستعلق بناہ بعد حین پڑھتے تھے، آخر جنگ کا مطلع صاف ہوا، اور امیر کی سیاست پختہ اور صحیح ثابت ہوئی، دوران جنگ میں امیر پر جمال پاشا سفاح کی پاسداری کا الزام بھی لگایا گیا تھا، حالات سازگار ہونے کے بعد امیر البیان نے ایک سلسلہ مضامین میں ان الزامات کی تردید کی، سید رشید رضا پر اسکا اثر ہوا اور پورا سلسلہ المنار سنہ [illegible] میں شائع ہوا، ابتدا میں مرحوم کے قلم سے ایک زبردست تائیدی تذرہ بھی تھا، جو مرحوم کی سچائی اور قبول حق کا شاہد ہے، "دوران جنگ میں شام کے حوادث" اس سلسلہ مضامین کی سرخی تھی، اس کتاب میں اسی عنوان سے مرحوم کا تائیدی نوٹ درج کیا گیا ہے، جو بارہ صفحات (ص ۱۹۴ - ۲۰۵) پر مشتمل ہے،

۴- الرحلة الاوربية، سید رشید رضا شامی[1] کانفرنس کی شرکت کے خیال سے جنیوا تشریف لے گئے تھے، اس سلسلہ میں امیر البیان کے ساتھ یورپ کے دوسرے ملکوں کی سیاحت بھی کی تھی، المنار میں الرحلة الاوربية کے عنوان سے روداد سفر شائع ہوئی تھی، اس میں زیادہ تر ماہرین سیاست کی ملاقاتوں کا ذکر ہے، اور اسلامی ملکوں کی سیاست پر کافی بحث کی گئی ہے،

۵- نابغة السید رشید لاخی نسیب امیر شکیب ارسلان کے بھائی، امیر نسیب ارسلان بھی عربی کے ایک قادر الکلام شاعر اور خطیب تھے، انجمن اتحاد و ترقی کی شاخ (بیروت) کے سرگرم کارکن اور لیڈر تھے، آخر میں سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، سنہ ۴۶ھ میں ان کا انتقال

[1] المؤتمر السوری الفلسطینی جس کا پہلا اجلاس [illegible] میں جنیوا میں ہوا اور صدر دفتر وہیں [illegible] امیر شکیب ارسلان کی نگرانی میں قائم ہوا،

ہوا، اس وقت امیر البیان جلاوطن تھے، دونوں بھائیوں میں ایک عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اسلئے صدمہ سخت اور جانگسل تھا، سید رشید رضا نے اس حادثہ پر ایک دردانگیز اور حکیمانہ خط امیر کو لکھا تھا، خط اور امیر کا جواب دونوں المنار اور اکثر مشہور اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے تھے، اور مستند ادیبوں نے ان کو بلاغت کا بہترین نمونہ قرار دیا تھا، یہ دونوں مکتوب بجا طور پر اس مجموعہ کی زینت ہیں، اور ہم آج پھر انھیں دوبارہ پڑھ کر وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ اس پایہ کی بلیغ اور معجز نما انشا پوری عربی ادبیات میں مشکل سے ملے گی، قرآن کریم، حدیث نبوی، اور دور اول کے خطبے اس سے مستثنیٰ ہیں،

۶- کتاب الوحی المحمدی، مرحوم کی مشہور تصنیف "الوحی المحمدی" پر امیر البیان کا تبصرہ جو المنار محرم سنہ ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا، (ص ۲۲۱ - ۲۳۱)

۷- امیر البیان کے سفرنامۂ حج (الارتسامات اللطاف فی خاطر الحاج الی اقدس مطاف) پر مرحوم کا مقدمہ (ص ۲۳۲ - ۲۴۱)

۸- حاضر العالم الاسلامی، ایک امریکن مصنف لوتھرپ سٹاڈرڈ (Lothrop Stoddard) نے سنہ ۲۱ء میں یا اس کے لگ بھگ جدید دنیائے اسلام (The new world of Islam) کے نام سے دنیائے اسلام کی سیاسیات پر ایک مفید کتاب لکھی تھی، اردو میں بھی اوس کے دو ترجمے ملک عبدالقیوم صاحب اور جمیل احمد صاحب بدایونی کے قلم سے شائع ہو چکے ہیں، اس کا عربی ترجمہ "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے استاذ عجاج نویہض اڈیٹر "العرب" نے کیا ہے، مزید افادہ کے خیال سے مترجم نے امیر البیان سے حواشی (فٹ نوٹس) لکھنے کی درخواست کی، امیر نے لکھنا شروع کیا، تو حواشی، اپنی ضخامت اور افادیت میں اصل کتاب سے بڑھ گئے، اور کتاب کی نسبت اصل مصنف کی جگہ محشی کی طرف ہونے لگی،

پہلا اڈیشن تیرہ چودہ سال پیشتر دو جلدون میں چھپا تھا، پھر امیر نے مزید اضافے کئے، اور دنیائے اسلام کی تحریکون پر ایسی سیر حاصل معلومات فراہم کین، کہ یہ کتاب آج بجا طور پر اسلامی سیاسیات کی انسائیکلوپیڈیا تسلیم کی جاتی ہے، نیا اڈیشن پانچ چھ سال ہوئے، چار جلدون مین شائع ہوا ہے، پہلے اڈیشن کی اشاعت پر سید رشید مرحوم نے تبصرہ کیا تھا، جو اس مجموعہ میں شامل ہے، (ص ۲۴۴ و ۲۵۱)

ان متفرق تحریرون کے بعد امیر البیان کے دو طویل مضمون ہین، جو مرحوم کی وفات پر ان کے قلم سے نکلے تھے، نیز ایک خط ہے، جو امیر نے اس حادثہ پر اپنے اور امام مرحوم کے معتقد، فلسطینی مجاہد سید محمد علی الطاہر، اڈیٹر "الشباب" کو لکھا تھا، (ص ۲۵۲-۲۸۰)

ایک صفحہ میں تعزیتی جلسون (حفلات التابین) کا ذکر ہے، کس قدر حیرت کا مقام ہے، امام سید رشید رضا کی یاد مین صرف چار معمولی جلسے ہون، قصائد اور خطبات کے لحاظ سے تونس اور دمشق کے جلسے غنیمت کہے جا سکتے ہین، بغداد کی مجلس مین صرف چار ادیبون نے نظم و نثر سے شرکت کی، قاہرہ کے تابینی جلسہ مین گو محمد الہراوی اور عبد اللہ عفیفی جیسے شاعرون اور عبد الرحمن شہبندر اور محمد لطفی جمعہ جیسے ادیبون نے خراج عقیدت ادا کیا، تاہم مرحوم کے سیاسی و علمی مرتبہ کے مقابلہ مین اسے کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اسی قاہرہ میں شوقی کا "مہرجان"، "المقتطف" کی پنجاہ سالہ جوبلی، شوقی و حافظ کے تابینی جلسے اس شان سے منعقد ہوئے ہین، کہ باید و شاید ابھی پچھلے سال اہل دمشق نے متنبی کی ہزار سالہ برسی اس تزک و احتشام کے ساتھ منائی ہے، کہ شاید متنبی کی روح مسرور ہو گئی ہو گی، لیکن خادمانِ دین مصطفوی کی قدر و منزلت اب اس دور مین کیون ہونے لگی ؛؟

تعزیتی جلسون کے سلسلہ مین امیر البیان کا وہ مرثیہ بھی زیب قرطاس ہے، جو دمشق کے جلسہ میں ان کی طرف سے پڑھا گیا تھا، مرثیہ مؤثر، دردانگیز اور امیر البیان کے شایان شان ہے

گو عاجز کی رائے مین امیر الشعراء شوقی کے مرثیہ مین، امیر البیان زیادہ کامیاب ہین، شوقی کے مرثیہ کا یہ غیر فانی شعر کسی طرح نہیں بھولتا :-

لو کان وحیٌ بعد وحی محمد لانشق ذالک الوحی عن آیاتہ

(اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کے بعد کسی وحی کا آنا ممکن ہوتا، تو (بلا شبہہ) اس وحی کا چشمہ شوقی کے معجزنما کلام سے پھوٹتا)

سید رشید مرحوم کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے :-

تحدری یا دموعی بالمیازیب وعارضی السحب اسکوبا باسکوب[1]

(ہان) اے آنسوؤ (غم) پرنالون کی طرح بہنا، اور اپنی روانی اور بہاؤ میں بدلیوں کا مقابلہ کرنا

مرثیہ کے بعد المقصورۃ الرشیدیۃ کو جگہ دی گئی، یہ مقصورۃ الرشیدیہ امام مرحوم کی ایک طویل اور مسلسل حکیمانہ نظم کا عنوان ہے، پوری نظم بیس صفحات (۲۰۵-۳۰۴) پر پھیلی ہوئی ہے، مرحوم نے یہ نظم ابن درید متوفی ۳۲۱ھ کے مشہور مقصورہ کے جواب (معارضہ) مین لکھی تھی، اور ایک خاص تقریب پر معارضہ اور نظم کی طوالت کے باعث بہت سے غریب اور مشکل الفاظ آ گئے ہین، اس لئے مرحوم نے بعض الفاظ کی تشریح خود کر دی تھی،

نظم کی تقریب اور تاریخ کی بابت خود ناظم کا بیان زیادہ مناسب ہوگا، خود نوشت سوانح حیات مین اپنی سخن سنجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

"میری آخری نظم مقصورۃ رشیدیہ ہے، جو مین نے مقصورۃ ابن درید کے جواب (معارضہ) مین لکھی تھی، یہ نظم دراصل مین نے اپنے ہم جلیس اور ہم سبق شیخ عبد القادر مغربی[2] کے اصرار

[1] الاسکوب، الہطلان الدائم [2] عبد القادر مغربی مشہور لغوی و ادیب المجمع العلمی العربی دمشق کے صدر، المجمع اللغوی الملکی مصر کے رکن، مجلۃ المجمع العلمی کے اڈیٹر، اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف و مصحح،

پر کہی تھی، ابتدا مین کل ایک سو انتیس[۹] شعر ہوئے تھے، اور ان کی تقریب شادی کے موقع پر بہ طور تہنیت پڑھے گئے تھے، پھر مقصورہ درید یہ کے معارضہ کا خیال ہوا، اور اس مناسبت سے دینی، فلسفی، ادبی اور اجتماعی خیالات اور نکتون کی آمیزش کے ساتھ نظم میں اضافہ کرتا گیا، خصوصیت کے ساتھ "اصلاح اسلامی" سے متعلق اپنے ان افکار و خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا، جنکی خاطر مین نے اپنی زندگی وقف کی اور مصر کی بود و باش اختیار کی، اس طرح پر چار سو شعر سے زائد ہو گئے، اسرار البلاغہ طبع اول ۱۳۱۷ھ کے حاشی مین اس کے بعض شعر مین نے بطور مثال کے پیش کئے تھے، سرخیل شعراء عصر محمود سامی پاشا بارودی[۱۰]، ان اشعار سے بہت محظوظ ہوئے اور خاص کر داد دی، مین نے کچھ اور شعر سنائے، تو انھون نے اسے دریدیہ پر ترجیح دی، اور چھپوانے کی، یا کم از کم اپنے لئے نقل کرانے کی خواہش کی، پھر مین نے اس کے بعض نمونے اسرار البلاغۃ کے دوسرے ایڈیشن میں بھی دیئے اور تاریخ الاستاذ الامام[۱۱] جلد اول ص ۵۶۰-۵۰۰ میں اس کا وہ حصہ شائع کیا، جو ان کی اصلاحات ازہر سے متعلق تھا"

اسی طرح جلد اول (ص ۹۰۸-۹۰۲) مین مقصورہ کا وہ حصہ بھی شائع کیا، جس میں سید جمال الدین کی اصلاحی دعوت اور مصر مین ان کے کارنامون کا ذکر تھا، اس مین کچھ حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا،

حافظ ابراہیم[۱۲] حسن و عشق والا ٹکڑا سن کر کہنے لگے، کہ "طویل اور بے عیب نظم

---

[۱۰] مشہور ادیب و شاعر جو وزارت کے منصب سے بھی سرفراز ہوئے، عرابی پاشا کی مشہور مہم میں یہ بھی ان کو جلا وطن کر دیئے گئے تھے، مصر کی جدید ادبی بیداری میں ان کا بڑا حصہ ہے، (متوفی ۱۹۰۴ء) [۱۱] سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کی مفصل سیرت، سید رشید مرحوم کے قلم سے (تین جلدوں میں) [۱۲] اس عہد

مین قافیہ تمھارا بہت ساتھ دے رہا ہے، لیکن بھائی اگر تم شعر ہی کہنے لگے، تو پھر ہم لوگوں کو فقہ اور فتوی نویسی اپنا مشغلہ بنانا پڑے گا"! اگر موقع ملا تو مشکل الفاظ کی تشریح کیساتھ مقصورہ کو طبع کراؤنگا، " (ص ۱۱۳-۱۱۵)

ان تمام چیزون کے بعد (مناجاۃ اخ لاخیہ[۱۳]) کے عنوان سے صاحب سیرت کے خطوط درج کئے گئے ہین، جو اس مجموعہ کا بڑا حصہ (ص ۳۰۵-۵۰۰) اور خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اور صحیح معنوں میں گذشتہ بیس سالوں کی سیاسی و ادبی واقعات کا مرقع ہین امیر البیان اور مرحوم کے درمیان تعلقات تو یوں چالیس سال سے تھے، اور اس اثنا مین خط و کتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، لیکن سیاسی خلفشار اور امیر البیان کے مسلسل سفر اور نقل و حرکت کے باعث جنگ عظیم سے قبل کا ذخیرہ محفوظ نہ رہ سکا، اس مجموعہ مین صرف وہ خطوط ہین، جو امام مرحوم نے جنیوا کی شامی کانفرنس (منعقدہ ۱۹۲۱ء) سے واپسی کے بعد امیر کو لکھے، ان مکاتیب کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے، اور سب مرحوم کے دست خاص کے لکھے ہوئے ہین،

اکثر خطوط طویل ہین، صفحہ دو صفحہ کے مکتوب بہت کم ہیں بعض دس بارہ صفحوں تک پہنچ گئے ہین ایسے خطوط بھی ہیں، جن کی حیثیت ایک مستقل رسالہ کی ہو گئی ہے، (ص ۳۰۶)

امیر البیان کی رائے میں مکتوبات رشیدیہ (امیر البیان نے اس مجموعہ کا یہی نام رکھا ہے)

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) کے مشہور قومی و اجتماعی شاعر شیخ محمد عبدہ کے معتقد اور شاگرد، جن کا انتقال ابھی ۱۹۳۲ء میں ہوا ہے، کہا جاتا ہے، کہ حافظ ابراہیم کا سب سے اچھا کلام شیخ محمد عبدہ کا مرثیہ ہے، اس دلگداز مرثیہ کے یہ دو شعر بہت مشہور ہین،

سلامٌ علی الاسلامِ بعدَ محمدٍ — سلامٌ علی ایامهِ النَّضِرات

عَلی الدِّینِ وَالدُّنیا علی العلمِ والحِجی — علی البرِّ والتقوی علی الحسنات

[۱۳] دوستوں میں راز و نیاز کی باتیں) اس کا ترجمہ کر سکتے ہین،

سید رشیدؒ کی تمام تحریرون پر بھاری ہین،

"اگرچہ ان کی انشا رکی مثال باران رحمت کی ہے، متقدم، متاخر ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی، (ص ۳۰۶)

یہ خطوط ایک دوست کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہین، ان مکتوبات کے آئینہ مین ان کے خط و خال صاف نظر آتے ہین، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگار کا ظاہر و باطن یکسان تھا، خیالات اخلاص، جرأت، علو ہمت، مروٗت، پاس عہد، ان تمام اوصاف کے لحاظ سے المنار کے بلند بانگ ایڈیٹر اور ان نجی تحریروں کے در دمند مصنف میں ذرہ برابر فرق نہیں معلوم ہوتا، (ص ۳۰۷، ملخص)

امیر البیان بار بار لکھتے ہین کہ بلاغت اور حسن انشار کے اعتبار سے یہ مکتوبات امام مرحوم کی تمام تصنیفات پر بھاری ہین،:۔

"ولذلك قلت ان هذه الرسائل الخاصة هي اعلى ماجرى به قلمُ السيد رشيد فی حياته كما يتضح لكلّ ذی بصرٍ بصناعة الكتابة (ص ۳۰۷)

ان خطوط کی بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ جنگ عظیم سے لیکر اب تک کے تمام ان حوادث پر جن سے مسلمانان عالم کو گذرنا پڑا، یا گذرنا پڑ رہا ہے، سید مرحوم کی رائین اور تاثرات ان میں موجود ہین، کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں جن کا ان میں ذکر یا اشارہ نہ ہو (صـ)

جہان اشارات و تلمیحات ہین، وہان امیر البیان کے قلم کی گلکاریون نے چار چاند لگا دیئے ہین

ان مکتوبات مین دینی، لغوی، اجتماعی، تاریخی سیاسی ہر قسم اور ہر رنگ کی بحثین ہین بیسیون مسئلوں میں مجھ سے چھیڑ چھاڑ چلی ہے، جہاں میری اور ان کی رائیں ایک دوسرے سے الگ تھیں، لیکن ان تمام بحثوں مین مرحوم نے اپنی برتری یا تنزہ عن الخطار، کا کبھی ادعار

نہین کیا، اور نہ کبھی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد اعتراف خطا مین جھجک محسوس کی،

(صفحہ ۳۰۸)

ان خطوط میں امیر نے کہیں ترمیم نہین کی ہے، البتہ کہیں کہیں سیاسی معاملات کے سلسلہ مین اسمار حذف کر دیئے ہین، اور ان کی جگہ نقطے (......) استعمال کئے ہین، یا اشخاص کی جگہ (فلان) پر اکتفا، کیا ہے، بعض سیاسی اسرار جن کا ظاہر ہونا شام اور فلسطین کی موجودہ سیاسیات کے لئے نقصان رسان ہوتا، یکسر حذف کر دیئے ہین، لیکن با این ہمہ ایک حرف کا اضافہ یا ترمیم مطلق نہیں ہوئی ہے، (ص ۳۰۹۔ ملخص)

مکتوبات رشیدیہ کے بعد امام مرحوم کے شاگرد اور شریک کار نسبتی بھائی اور ابن عم، سید عبد الرحمن عاصم کے تین خطوط (ص ۹۹، ۸۰۷) ہین، جو انھوں نے اپنے استاذ و مرشد کی وفات کے بعد امیر البیان کو لکھے تھے، یہ تین مکتوب اپنے اندر عبرت کے ہزاروں سبق پنہان رکھتے ہین ایک مجاہد کی چالیس سالہ خدمات کا بدلہ اس دنیا مین یہ ملتا ہے، کہ رہنے کا مکان رہن، پریس مقروض، لڑکوں کی تعلیم کا انتظام نہیں، خریدار چندے کھائے بیٹھے ہیں، کتب فروش قیمت ادا کرنا نہیں جانتے، امام مرحوم کی وفات کے بعد طرابلس الشام کے سید زادے، اپنے کو مصر کے بازار میں روٹیون کا محتاج پاتے ہیں،

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

آخر میں تین صفحون کا ایک ضمیمہ ہے، جس میں سید مرحوم کے نسب پر گفتگو کی گئی ہے، اور صحت نسبت کے تواتر اور شہرت کی شہادتیں پیش کی گئی ہین، (۸۰۹، ۸۱۱)

خاتمہ پر تفصیلی فہرست (۸۱۲ - ۸۳۲) ہے، انڈکس نہیں، پھر بھی تمام قابل ذکر مواد کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے،

یہ کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، اب ہم صاحب سیرت کے خود نوشت سوانح حیات، خطوط اور بعض دوسری چیزون پر ذرا تفصیلی گفتگو کرنا چاہتے ہین،

خود نوشت سوانح حیات امام مرحوم کے خود نوشت سوانح حیات تقریباً سوا سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اس مختصر سی تحریر مین پورا خلاصہ نہیں دیا جاسکتا، پھر بھی ان کی کتاب زندگی کے چیدہ اوراق پر نظر ڈالنا ضروری ہے، آئیے، ہم انہی کے آئینہ میں ان کی تصویر دیکھیں، صاحب سیرت کے تقوی اور راست بازی سے توقع ہے، کہ ان کی قلمی تصویر سچی اور سبق آموز ہوگی، اقتباسات میں کہیں ترجمہ کہیں تلخیص پر اکتفا کیا گیا ہے،

خاندان اور ماحول "میری پیدائش اور نشو و نما طرابلس الشام سے تین میل دور بحر متوسط کے ساحلی گاؤں قلمون میں ہوئی، اس گاؤن کے باشندے سب مشہور النسب سادات تھے، البتہ گذشتہ صدی میں کچھ اہل لبنان بھی وہان آکر آباد ہو گئے تھے، غربت، گم نامی، اور مخصوص اوقاف نہ ہونے کی وجہ سے آپس مین تفرقی کی ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوئی، پھر بھی گاؤں کے بڑے بوڑھے بیرونی خاندانوں سے خوب واقف تھے،

گاؤن والے شرافت اور حسن اخلاق میں مشہور تھے، ان کی نسبت کوئی بری بات سننے مین نہین آئی، البتہ کبھی کبھی پھلوں کی چوری، اور آپس میں سر پھٹول کی خبرین سننے میں آتی تھین،

"ہمارا خاندان علم و تقوی میں ممتاز تھا، وعظ و ارشاد کے باعث "مشائخ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، میرے پر دادا نے بستی کی مشہور مسجد تعمیر کرائی تھی، وہ بہت متورع اور متقی عالم تھے، عثمانی حکومت سے وظیفہ مقرر تھا، امامت اور خطابت کی سند بھی عطا ہوئی تھی؛ اس سلسلہ کا آخری وظیفہ اور سند جنگ عظیم سے پہلے سلطان وحید الدین کے دربار سے میرے نام جاری ہوئی

ہمارا گھر میز بانی اور خاطر و مدارات میں مشہور تھا، ہمارے دادا کے تعمیر کردہ گھر کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا "ہر مذہب و ملت کے مہمانوں کے لئے ہمارا گھر کھلا ہوا ہے"، میں نے خود اپنی آنکھون سے طرابلس کے علما، حکام، اور عمائد کو گرمی کے موسم مین اپنے ہان برابر قیام کرتے دیکھا ہے، میں ابتدائے سن شعور سے حکام اور امرا، کی نسبت، علما، کی طرف زیادہ مائل تھا،

میری کمسنی میں دادا کا انتقال ہوگیا تھا، اس کے بعد میرے والد ماجد گھر کے مالک قرار پائے، والد کے چچا شیخ احمد شب و روز عبادت میں مشغول رہتے، علما، اور خاص دوستون کے سوا کسی سے نہیں ملتے، عصر اور مغرب کے درمیان باہر بیٹھتے، ان کی مجلس ادب و وقار سے معمور ہوتی، فضول گوئی یا ہنسی مذاق کی گنجایش ان کے سامنے نہیں تھی، خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ طرابلس کا فوجی افسر جو نہایت متکبر اور پر ہیبت تھا، شیخ کی زیارت کو آیا، طرابلس میں علما، اور صالحین کی تعظیم اس افسر کے ہاں نہیں ہوتی تھی، یہ سب کو معلوم تھا، شیخ سے اس کے لئے اجازت طلب کی گئی، لیکن انھون نے اجازت نہ دی، اس نے پھر دیکھنے کی خواہش کی، لوگون نے کہا، ٹھہر جاؤ، نماز کو مسجد جائین گے تو زیارت ہو جائے گی، آخر وہ نماز کو آئے، اور سلام کے بعد یہ شعر پڑھ کر کہا کہ کسی نفرت یا ذاتی پرخاش کے وجہ سے انھیں ملنے سے انکار نہیں، دوسرے شعر کا پہلا مصرع سہو ہوگیا، حالانکہ مشہور ہے،

أنست بوحدتی ولزمت بیتی وطاب الانس لی وصفا السرور

. . . . فلا أزار ولا أزور

ولست بسائل ماعشتُ یوما أسار الجند أم رکب الامیر

ا۔ میں اپنی تنہائی سے مانوس ہوگیا، اور ایک گوشۂ عافیت اختیار کرلیا، اسی میں از دل

---

[۱] سید رشید رضا نے یہان پر کوئی ایسی بات نہیں لکھی جسے تمام اہل طرابلس نہ جانتے ہون،
(شکیب ارسلان)

کی خوشی ا ہے، اور فرحت کی پاکیزگی،

۲۔ ...... نہ کوئی مجھ سے ملتا ہے، نہ میں کسی کے ہاں جاتا ہوں،

۳۔ مجھے کبھی کسی کی فکر نہین ہوتی، فوج کی نقل و حرکت ہو، یا حاکم کی آمد، (مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا)

اس واقعہ سے اپنے خاندان کی وقعت میری نگاہوں میں بہت بڑھ گئی، اور یہ خیال جم گیا کہ اگر شرافتِ نسب کے ساتھ تقویٰ اور بلند حوصلگی بھی ہو، تو پھر انسان دین و دنیا ہر جگہ سرخرو ہو سکتا ہے" (ص ۲۳-۲۶)

تعلیم و تربیت میری ذکاوت ضرب المثل تھی، علما، اور وجہار برابر والد ماجد کو میری تعلیم کی طرف متوجہ کرتے، اور میری کامیابی و حصولِ کمال کی بڑی بڑی امیدین دلاتے تھے، مجھے یہ مبالغہ آمیز باتیں عجیب و غریب معلوم ہوتیں، صالح بھائی کا حافظہ مجھ سے اچھا تھا، اور میرے نزدیک حافظہ ہی ذکاوت کا معیار تھا، شاید ہی کبھی ایک بار سن کر کوئی شعر یاد رہ گیا ہو،

آغاز تعلیم مین طلبہ ہر علم کی تعریفیں لفظ بہ لفظ یاد کرتے تھے، لیکن میں سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، البتہ جن کتابوں کا حفظ کرنا مدرسہ کی جانب سے ضروری تھا، اس مین مجبوری تھی جیسے الفیہ منطق میں سلم کا متن جوہرۃ التوحید اور حریری کے بعض مقامات، ...... (ص ۳۳)

...... خلاصہ یہ کہ میں سرعتِ فہم میں ممتاز تھا، خصوصیت کے ساتھ مدلل اور عقلی چیزوں پر میں بہت جلد حاوی ہو جاتا تھا، اس لئے منطق کا مشکل فن میرے لئے بہت آسان تھا، صرف قضایا کے عکس اور نقیض میں کچھ الجھن ہوتی تھی"

سلم اور منطق کا تذکرہ بتاتا ہے، کہ گذشتہ صدیوں میں فرسودہ معقولات کی یہ مصیبت صرف ہندوستان ہی پر نہیں آئی تھی، بلکہ طرابلس الشام بھی اسی آفت میں مبتلا تھا، بات پر بات نکلتی ہے،

معلوم ہوا ہے، کہ اب تک ازہر کے اصلاح شدہ کالجون (کلیات) میں مسلم الثبوت پڑھائی جاتی ہے، اور خود شیخ مصطفےٰ مراغی بنفس نفیس مسلم الثبوت کا درس دیتے ہین، !!

طرابلس الشام میں تعلیم و تربیت کا حال کچھ اور سنیئے:۔

"مین نے اپنے گاؤں (قلمون) کے مکتب مین قرآن مجید (ناظرہ) اور معمولی نوشت و خواند کی تعلیم حاصل کی، پھر خاص طرابلس کے مدرسۂ رشیدیہ مین داخل ہوا، یہ سرکاری ابتدائی مدرسہ تھا، جس مین صرف، نحو، جغرافیہ، عقائد (مبادی) ترکی اور عربی کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن تمام علوم کی تعلیم ترکی زبان[1] مین ہوتی تھی، ایک سال وہان پڑھتا رہا، پھر چھٹیوں کے بعد مدرسہ واپس نہیں گیا کہ مجھے سرکاری ملازمت مطلوب نہ تھی،

اسکے بعد پھر مدرسہ اسلامیہ قومیہ میں داخل ہوا، یہ مدرسہ رشدیہ سے ترقی یافتہ تھا، تعلیم کی زبان عربی تھی، صرف ترکی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھی، اس میں تمام عربی و دینی علوم کے علاوہ منطق، ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی، مدرسہ کے بانی اور مہتمم علامہ شیخ حسین الجسر[2] ازہری تھے، ان کے خیال مین مسلمانون کی ترقی دینی اور دنیوی علوم کی آمیزش کے بغیر ناممکن تھی، وہ اسلامی تربیت اور جدید یورپین اور امریکن طریقۂ تعلیم کو ایک ثقافت میں سمونا چاہتے تھے،

گویا آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے طرابلس مین ندوۃ العلماء کی داغ بیل پڑ چکی تھی، ندوہ ایک فکر اور نصب العین کا نام ہے، کوئی حیرت کی بات نہیں، اگر دو چار سال آگے پیچھے، طرابلس اور ہندوستان کے علما، کو ایک ہی چیز کا احساس ہوا ہو، اور نبض شناسانِ امت نے نسخہ بھی

[1] ترکون کی یہی قومی پالیسی تھی، جس نے عربوں کو بددل کر رکھا تھا، آخر اس کے برے اثرات ظاہر ہوئے اور دونوں کو خمیازہ بھگتنا پڑا، [2] علامہ شیخ حسین جسر، شیخ محمد عبدہ کے ہم عصر اور گذشتہ دور کے مشہور روشن خیال عالم تھے، مشہور رسالہ حمیدیہ ان ہی کی تصنیف ہے (مولود ۱۲۶۱ھ متوفی ۱۳۲۷ھ)

ملتا جلتا تجویز کیا ہو، لیکن اس سے زیادہ عجیب تر بات یہ ہے، کہ اگر ہندوستان میں اس تحریک کو اندرونی و بیرونی مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا، تو طرابلس میں ترکی حکومت کی نگاہ کرم اُسے کھا گئی، رہ نوردانِ طریقِ محبت کی مشکلات بھی یکساں ہیں،

ترکی حکومت میں، دینی مدرسوں کے طلبہ وعظ وارشاد کے بدلے میں فوجی خدمت سے معاف رکھے جاتے تھے، اس مدرسہ کے بانی اور شرکار کا قصد بھی خالص دینی تھا، لیکن حکومت اسے دینی مدرسہ ماننے پر راضی نہیں ہوئی، "آخر حکومت کی جہالت اور کم فہمی کے باعث طرابلس اور اس کے مضافات اس مدرسہ کے فوائد سے محروم ہوگئے"، مدرسہ بند کرنا پڑا، اور شیخ حسین جسر کے شاگردوں میں جدھر جس کا سینگ سمایا نکل گیا، کچھ مستقل مزاج طرابلس ہی میں رک گئے، انہی میں صاحب سیرت بھی تھے، اور درحقیقت ان کے طلب علم[1] کا صحیح دور اب شروع ہوتا ہے،

"طلب علم سے پہلے ادب و تصوف کی کتابوں کا بہت شوق تھا، تصوف کی تمام کتابوں میں حجۃ الاسلام امام ابوحامد غزالی کی احیاء العلوم مجھے بہت محبوب تھی، اُسے میں بار بار پڑھا کرتا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا کرتا تھا، اور میرے علم وعمل اور دین واخلاق پر اس کتاب کا بہت اثر تھا، اور واقعی یہ کتاب بہت مفید ہے گو بعض حصے نقصان رساں بھی ہیں، علم سے بہرہ ور ہونے کے بعد مجھے نقصانات کا تدارک کرنے میں دقت نہیں ہوئی، حدیث وسنت کے مشغلہ کے بعد احیاء کی علمی غلطیوں خصوصیت کے ساتھ جبریہ کے عقائد، اشعریہ اور صوفیہ کی تاویلوں تقشف اور نوتراشیدہ عبادتوں سے رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا" (ص ۳۶، ۳۷)

مجھے شعرانی کی الیواقیت والجواہر بہت پسند تھی، انکی دوسری کتابوں خصوصاً طبقات[2]

[1] یعنی طلب علم کے دوسرے دور سے پیشتر [2] طبقات شعرانی سے مراد لواقح الانوار فی معرفۃ طبقات السادۃ الاخیار ہے، عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ،

کی نسبت اس میں خرافات کم ہیں، میزان[1] میں اجماع کا باب دل کو بہت لگتا تھا، خصوصیت کے ساتھ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر محمول کرنا، اس انتخاب اور پسند میں طبعی استعداد کے سوا اور کوئی رہنما نہیں تھا، میں ابتدائے نشوونما سے عبادت واخلاق میں صوفی تھا، ادب کا رجحان بھی قوی تھا، اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں پڑھیں، منظومات کی ایک بڑی تعداد بلاارادہ حفظ ہوگئی، شہرزوری[2] کا صوفیانہ قصیدہ اور ابن زیدون[3] کا مشہور نونیہ قصیدہ بھی اسی طرح یاد ہوگیا تھا" (ص ۳۸)

علامہ رشید رضا مرحوم کو فنون ادب میں بھی اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی، عام علمائے ازہر کی طرح وہ صرف ایک "شیخ" نہیں تھے، شروع ہی سے وہ بکثرت کتب لغت دیکھنے کے عادی تھے، مدرسہ ہی میں ان کی لغوی استعداد کی شہرت ہوگئی تھی، جب لغت کی کتابیں نہ ہوتیں، تو شیخ جسر مشکل الفاظ ان سے پوچھتے، اور یہ شافی جواب دیتے، (ص ۳۰)

اسی وجہ سے سید رشید پڑھنے میں اعراب کی غلطی (لحن) شاذونادر کرتے تھے، صرف و نحو سے ناواقف ہونے کے باوجود وہ عبارت خوانی میں ممتاز طلبہ پر سبقت لیجاتے تھے، حقیقت یہ ہے، کہ صرف و نحو کی کتابی تعلیم ادبی استعداد پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے، ہم اپنے ملک میں تو اس امر کی ہزاروں مثالیں روزانہ دیکھتے ہیں، لیکن امام مرحوم کی زبانی طرابلس الشام کا تعلیمی تجربہ سن کر اپنے خیال و تجربہ کی مزید تصدیق ہوئی،

امام مرحوم کے زمانہ طالب علمی میں وہی متاخرین کا فرسودہ طریقہ تعلیم رائج تھا، متون کا حفظ، حواشی کی بھرمار، اصل فن سے تغافل، مغز کی جگہ چھلکوں پر اکتفاء، اس دور کی خصوصیتیں تھیں

[1] شعرانی کی مشہور کتاب [2] شہرزوری سے مراد غالباً قاسم بن مظفر بن علی شہرزوری ہیں، [3] ابن زیدون (المتوفی ۴۶۳ھ) مشہور اندلسی شاعر جس کا نونیہ قصیدہ ہر دور میں پسند کیا گیا ہے،

لیکن صاحب سیرت کو شیخ حسین جسر کی صورت میں نعمت غیر مترقبہ ملی، وہ ایک مجتہد الفکر عالم اور اپنے عہد کے علما سے ممتاز تھے ان کا طریقہ تعلیم بھی جداگانہ تھا، لایعنی شروح وحواشی ان کے حلقۂ درس میں بار نہیں پا سکتے تھے، منطقی کج بحثی اور لفظی چھیڑ چھاڑ کو بھی وہ اہمیت نہیں دیتے تھے، وہ فن پڑھاتے اور شاگردوں کے ذہن و دماغ میں اس کے مسائل اُتار دینا چاہتے تھے، ازہر میں بھی وہ رہے تھے، لیکن کم، اور وہاں بھی شیخ حسین مرصفی جیسے لغوی اور ادیب کی صحبت ملی، جس سے ان کی ادبی صلاحیتیں چمک اٹھین،

امام مرحوم نے شیخ جسر سے ادبی اور عقلی علوم کی تحصیل کی، جدید علوم سے وہ اچھی طرح واقف تھے، رسالہ حمیدیہ اس کا بہترین شاہد ہے، عربی کے اچھے انشا پرداز اور "عصری" شاعر تھے، یعنی ان کی منظومات متاخرین کی تک بندیوں سے بلند تھین،

حدیث وفقہ کی تحصیل کے لئے انھون نے علامہ شیخ محمود نشابہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، شیخ نشابہ ازہر مین متعلم ومعلم دونوں حیثیتوں سے تیس سال قیام کر چکے تھے، اور انھیں اٹھارہ علون (جس میں جبر ومقابلہ بھی شامل ہے) میں ازہر کی سند حاصل تھی

پہلے پہل ان سے اربعین نووی پڑھی، اور اسکی باضابطہ تحریری اجازت حاصل کی، علامہ[1] عبدالغنی رافعی سے نیل الاوطار کا کچھ حصہ پڑھا لیکن درس وتدریس سے زیادہ ان کی صحبت سے مستفیض

[1] شیخ عبدالغنی رافعی طرابلس الشام کے رافعی خاندان کے مشہور عالم تھے، پچھلی صدی ہجری کے آخر دور میں یہ استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے، رافعی خاندان مصر وشام مین علم وفضل کی حیثیت سے بہت ممتاز رہا ہے، موجودہ دور مین شام کے عبدالحمید رافعی (شیخ عبدالغنی رافعی کے بیٹے) اور مصر کے مصطفےٰ صادق رافعی اپنی آپ مثال تھے، مصطفےٰ صادق رافعی کے متعلق امیر شکیب کا یہ مقولہ زبان زد خاص وعام ہے،

لقد تنجب العرب مثلہ منذ مات من السنین عرب کی سرزمین سیکڑوں سال سے ان کا مثیل نہ پیدا کر سکی

ہوا، غزالی کی احیاء العلوم انھین بھی بہت محبوب تھی، اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے مواعظ بھی ان کے زیر مطالعہ رہا کرتے تھے، مشہور محدث شیخ محمد قاوقجی[1] سے بھی حدیث مین استفادہ کیا، (ص ۴۱)

درس وتدریس کی جگہ امام مرحوم کو حدیث کا صحیح ذوق ذاتی مطالعہ سے پیدا ہوا، احیاء العلوم کی حدیثون کی چھان بین کے سلسلہ مین یہ ذوق پختہ ہو گیا، ہندوستان کی چھپی ہوئی میزان الاعتدال طرابلس مین پہلے پہل آپ ہی نے منگوائی، میزان الاعتدال کا ملنا تھا کہ وعظ ومحاضرات کی کتابون کے پرخچے اڑنے شروع ہو گئے، مرحوم کی اس شدت کا یہ اثر تھا، کہ ان کے رفیق درس شیخ عبدالقادر مغربی نے میزان الاعتدال کا نام المقول الذہبی[2] رکھ دیا، مرحوم کا علمی ذوق حدیث و دینیات ہی تک محدود نہین تھا، وہ اسی زمانہ مین عبدالقادر مغربی کے ساتھ ڈاکٹر فانڈیک کی جدید کتاب النقش فی الحجر بھی پڑھتے تھے، اس میں جدید علوم کی مبادیات بیان کی گئی ہیں، (ص ۴۲ - ملخص)

زمانہ طالب علمی ہی مین مرحوم کی ذہانت ضرب المثل ہو چکی تھی، شیخ حسین جسر انھیں بہت مانتے تھے، شاگرد پر استاذ کا اعتماد اس قدر بڑھ گیا تھا، کہ وہ اپنے درس اور تالیفات کے متعلق شاگرد کی راے دریافت کرتے، اور شاگرد جو آگے چل کر "حق کی آواز" بننے والا تھا، پورے ادب کے ساتھ اپنی راے بے کم وکاست ظاہر کر دیتا،

طالب علمی کی ساری سرگذشت مین ہمین ایک چیز بہت نمایان نظر آتی ہے، مرحوم بلا سمجھے بوجھے کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہین ہوتے تھے، وہ ہر مسلہ کو علم وعقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے، ان کا یہی ابتدائی جوہر تھا، جس نے انھیں فنون حدیث کا نقاد کامل بنا دیا، تقلید، تصوف، فقہ

[1] ۱۹۲۵ء کے دروزی جہاد اور ۱۹۳۶ء کے فلسطینی جہاد کے قائد فوزی قاوقجی آپ ہی کے خاندان سے ہیں، شیخ محمد قاوقجی اپنے زہد وتقوی کے وجہ سے ولی شمار کئے جاتے تھے، (شکیب ارسلان - ص ۲۴۴ حاشیہ)

[2] میزان الاعتدال کے مصنف امام ذہبی کی نسبت سے (سونا) کی طرف تلمیح مقصود ہے (مقول) ہتھوڑے کو کہتے ہین،

ہر کوچہ سے گذرے لیکن ان کی طبیعت کتاب وسنت کے چشمۂ صافی کے سوا کسی چیز پر قناعت نہ کر سکی،

تصوف اور تنسک

امام مرحوم نے اپنے زہد وتنسک کی مفصل روداد لکھی ہے، حکایت لذیذ تھی زبان شوق اختصار پر قناعت نہ کر سکی، (ص، ۴۴-۹۲)

ہم عبادت کی لذت کے منکر نہیں، اور نہ تنسک وزہد کوئی معیوب چیز ہے، لیکن شب بیداری اور راز ونیاز کی باتون کو مزے لے کر بیان کرنے کا فلسفہ ہماری سمجھ سے باہر ہے! اگر شیخ محمد عبدہ کی رائے میں ابن عربی نے ان کیفیتوں کے بیان کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے، تو عاجز کی رائے میں علامہ سید رشید رضا نے بھی اپنی کرامتون کی تفصیل کرکے اسلام کی کوئی خاص خدمت انجام نہیں دی، امام غزالی اور دوسرے صوفیوں کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کہ ان کیفیات واحوال کی شرح وتفصیل فائدہ کے عوض ضرر رسان ہوتی ہے، صاحب سیرت خود احیاء العلوم کے کتاب الغرور کا حوالہ دیتے ہوئے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، پھر انہی چیزوں کی تفصیل وبسط میں ایسی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں، کہ سید رشید رضا کی خود نوشت سوانح حیات کے بجائے کسی شیخ طریقت کی سرگذشت معلوم ہوتی ہے،

عام صوفیوں سے اتنا فرق ضرور ہے کہ سید رشید جابجا بدعات کی تنقید کرتے جاتے ہین، پہلے وہ ورد السحر کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے، رمضان میں خاص طور پر اہتمام ہوتا تھا، حدیث اور سلف صالحین کے مشرب سے لذت آشنا ہونے کے بعد صرف قرآن کریم کی تلاوت پر اکتفا کرنے لگے، (ص ۹۴)

پہلے انھون نے دلائل الخیرات کی باضابطہ سند واجازت حاصل کی تھی، اور اسے تبرکاً اور تعبداً پڑھا کرتے تھے، حدیث وسنت میں لگ جانے کے بعد ان تمام اوراد سے ان کا جی چھوٹ گیا، جن مین وقت کی پابندی بلند آواز کی قید، اور دوسری غیر شرعی اور غیر ماثور ہیئت اور اشکال کے مل جانے سے بدعت کا شبہہ قوی ہوتا تھا، (ص ۵۰)

مرحوم نقشبندیہ طریقہ مین بیعت بھی ہو گئے تھے، اپنی عبادت وریاضت اوراد ووظائف اور ان سب سے بڑھ کر تصور شیخ کا تذکرہ دلچسپی کے ساتھ کرتے ہین، شکریہ ہے، کہ بدعات کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہین،

مرحوم نے بار بار اپنے کرامات کا تذکرہ کیا ہے، عام طور پر ملنے والے اور اعزا واقربا ان کی کرامتون کو مانتے تھے لیکن اُنھیں کبھی دعوکا نہیں ہوا، وہ اپنے مکاشفات کی حتی الامکان تاویل کرتے، اور انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے، احیاء العلوم کے کتاب الغرور مین ایسے صوفیوں کا حال پڑھ چکے تھے، اس لئے وہ اعجاب بالنفس کے فتنہ سے بال بال بچ گئے، وہ ان کرامات کی تردید بھی کرتے ہین،

اس سلسلہ میں شیخ یوسف نبہانی[1]، اور شیخ یوسف دجوی[2] سے اپنے قلمی مناظروں کا تذکرہ فرماتے ہین، اور ان کی خوش عقیدگی کا مذاق اڑاتے ہین، لیکن ہمین خلوت کی ملاقاتوں "تزکیۂ نفس" اور مکاشفات کا برملا تذکرہ کرنے ہی پر اعتراض ہے، اس سے اصلاح کی توقع کم ہے، نقصانات زیادہ ہین، بہرحال اس حصہ مین تصوف اور متصوفین کے متعلق بہت کچھ مسالہ موجود ہے، "منکرین" و "مومنین"

---

[1] ص ۶۱،

[1] شیخ یوسف نبہانی شام کے مشہور عالم صوفی ادیب وشاعر تھے، ان کا تقوی مشہور تھا، لیکن ولیون اور پیرون کے بہت معتقد تھے، اور محض اسی وجہ سے وہ شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا سے انتہائی بغض رکھتے تھے، ان کی وفات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا، معجم المطبوعات (ص ۱۸۳۵) میں ان کی ۴۰ تالیفات گنائی گئی ہین [2] یوسف دجوی کا شمار ازہر کے کبار علما میں ہے، لیکن ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پکے قبر پرست ہیں،

تصوف دونوں اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امر بالمعروف اور قلمی و زبانی جہاد کے متعلق امام مرحوم جو لکھتے، کم تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتابِ حیات کا سب سے درخشاں باب یہی ہے، وہ فطرت کی طرف سے ناقدانہ طبیعت اور جری دل لے کر آئے تھے، وہ ہر کھری کھوٹی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، سیاست، دین، اخلاق و ادب، ہر شعبۂ زندگی میں ان کے سامنے منکر چیزیں آتی تھیں، وہ اس قسم کی ہر شئے کو کتاب و سنت کی میزان پر تولتے تھے، عقلِ سلیم کی مقیاس لگا کر جانچتے تھے، جو قول یا عمل اس معیار پر پورا اترتا، اسے وہ صدقِ دل سے قبول کرتے، جو بات اس صراطِ مستقیم کے خلاف معلوم ہوتی، اسے ٹھکرا دیتے، اس باب میں وہ عوام کی رضا جوئی، یا حکام و عمائد کی خوشنودی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ان کی ساری زندگی منکرات کے خلاف مسلسل جہاد میں بسر ہوئی، ازہر کی سرکار سے معتوب ہوئے، عثمانی حکومت کے تیرِ ستم کا نشانہ بنے، مالی نقصانات اور خانگی پریشانیوں کا کیا ذکر، کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے، اور مرحوم اس سے گذر چکے تھے،

امام مرحوم نے کبھی ملازمت کی خواہش نہیں کی؛ اور نہ وہ شیوخِ ازہر کی طرح ہزار بارہ سو ماہوار آسانی سے حاصل کر سکتے تھے، اہلِ علم کی ایک دوسری "قسم" کی طرح وہ علم کے غلام بھی نہیں تھے، وہ اپنے علم سے خلق اللہ کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے، اس باب میں بھی وہ احیاء العلوم کا برابر ذکر کرتے تھے، احیاء کے باب (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا ان پر بہت اثر تھا، (ص ۹۴)

نہی عن المنکر" کے سلسلہ میں پہلا واقعہ انہیں اصحابِ حال و قال کے ساتھ پیش آیا، مولویہ سلسلہ کے مشائخ اپنے طریقہ کے مطابق رقص و سرود[1] میں مصروف تھے، دو چار چکر کے بعد پیر کے

[1] مصنف رح نے جن الفاظ میں اس مجلسِ سماع کا نقشہ کھینچا ہے، ان کی صحیح تعبیر "رقص و سرود" ہی کے فقرہ سے ہو سکتی ہے، (ملاحظہ ہو ص ۹۵)

آگے جھکتے (یرکعون لہ) اور قدم لیتے تھے، مرحوم کے لئے یہ پہلا موقع تھا، ان سے ضبط نہ ہو سکا، انہوں نے سختی کے ساتھ لوگوں کو اس بدعت سے روکا، اس کی غیر مشروعیت واضح کی، شرکائے مجلس کو اتخذوا دینھم ھزوًا ولعبًا کا مصداق قرار دیا، اپنا فرض ادا کر کے وہ مجلس سے اٹھ آئے، دو چار بندگانِ خدا ان کی دعوت سے متاثر ہوئے اور ان کے پیچھے ہو لئے،

اس واقعہ کا بڑا چرچا رہا، شیخ حسین الجسر بھی مشائخِ طریقت سے تعرض اچھا نہیں سمجھتے تھے، شاگرد کو باز رکھنے کی کوشش کی، شاگرد و استاذ میں دلچسپ مباحثہ رہا، آخر استاذ نے تنگ آ کر ارشاد فرمایا،

ہمارا مذہب (حنفی) تمہارے مذہب (شافعی) سے حرمتِ سماع میں زیادہ سخت ہے، لیکن میری نصیحت یہی ہے، کہ تم مشائخِ طریقت کو نہ چھیڑو" (ص ۹۶)

شیخ حسین جسر بھی دراصل خلوتیہ سلسلہ میں بیعت تھے، اپنے والد سے انہیں "خلافت" بھی حاصل تھی استاذ و شاگرد کا یہ اختلاف یہیں ختم نہیں ہوا، شاگرد نے جب مصر پہونچ کر لوگوں کو شیخ بدوی کی قبر کا طواف کرتے اور ان کے نام کی قسم کھاتے دیکھا، اور مصر کی بدعات کے سامنے طرابلس کی بدعات انہیں ہیچ معلوم ہونے لگیں، تو ان کا جوشِ عمل اور تیز ہو گیا، المنار میں یہ تیزی نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی، صاحبِ سلسلہ استاذ سے نہ رہا گیا، خط و کتابت کے ذریعہ متصوفین کی مخالفت سے روکنے کی کوشش کی، دلیل عجیب انوکھی تھی کہ شیخ جسر کے خیال میں سید رشید مسلمانوں کے عیوب غیروں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتے تھے، ان کا علم بدعات کو بدعت تسلیم کرنے پر مجبور تھا، لیکن "سلسلہ" کے تعلقات اب وجد کی تقلید جواز کے دوسرے حیلے تلاش کرنا چاہتی تھی، شاگرد نے استاذ کے مکتوب کا مفصل جواب گیارہ صفحات میں دیا، اور پوری سعادت مندی کے ساتھ لکھا،[1]:-

"میں ابھی تک اپنے کو آپ کا وہی حقیر شاگرد سمجھتا ہوں، اگرچہ آپ نے عالمیت کی سند اور

[1] اس تاریخی خط کی نقل غالبًا صدیق عزیز شیخ عبد القادر مغربی کے پاس محفوظ ہے، (رشید رضا)

تدریس کی اجازت سے مجھے سرفراز فرمایا ہے، حضرۃ الاستاذ کو خوب معلوم ہے کہ میں عہد طالب علمی میں بھی کبھی کوئی بات بلا سوچے سمجھے نہیں مانتا تھا، میرے دلائل یہ ہیں...... اگر آپ میری غلطی کا مجھے یقین دلا دیں تو اپنی رائے سے مراجعت اور "المنار" میں اس کا اعلان کرنے کو تیار ہوں"۔

(ص ۹۰)

استاذ نے خط کے جواب میں خاموشی اختیار کی، لیکن اخبار "طرابلس" میں اپنے قلم سے شاگرد کی تردید کی، اور شاگرد نے "المنار" میں اس کا جواب دیا، آخر تعلقات کشیدہ ہو گئے، اس کے بعد شیخ جسر کا مصر آنا ہوا، تو سید رشید ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے، رخصت کے وقت شاگرد رشید نے استاذ سے نصیحت کی درخواست کی، استاذ نے حسب سابق متصوفین کی تردید سے باز رکھنے کی کوشش کی، شاگرد نے دلیل طلب کی، اس پر گفتگو ختم ہو گئی، اور یہ اختلاف باقی رہ گیا، (ص ۹۱)

سید رشید جب اپنے استاذ کے مقابلہ میں، راہِ حق سے ذرہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے، تو پھر ازہر کی سرکار سے کیوں مرعوب ہوتے، ؟ مبتدعین ازہر اور خصوصاً شیخ یوسف دجوی کی خوب خبر لی، شیخ مراغی کے برسر اقتدار ہونے سے پہلے (مجلۃ الازہر) کا نام نور الاسلام تھا، اس زمانہ میں "المنار" کے ایڈیٹر اور شیخ یوسف دجوی (رکن جماعت کبار علمائے ازہر) سے خوب چلتی تھی، استاذ محترم حضرت شیخ تقی الدین ہلالی مدظلہ (حال پروفیسر بون یونیورسٹی جرمنی) "دجوی" کی مناسبت سے رسالہ نور الاسلام کو "ظلام الاسلام" کہا کرتے تھے، ازہر اور المنار کی جنگ میں تمام علمائے حق نے المنار کا ساتھ دیا، اور رسالہ نور الاسلام کے اس رویہ کی مذمت میں سب متحد اللسان تھے،

مرحوم کا جذبہ جہاد صرف متصوفین اور علماء سوء ہی تک محدود نہ تھا بلکہ عمائد سلطنت اور ترک حکام کے منکرات کے خلاف اس جذبہ کا اظہار، اور زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا تھا، عہد طالب علمی کے اس قسم کے متعدد واقعات اہل طرابلس میں زبان زد تھے، (ص ۹۰-۱۰۲)

سید رشید صرف علمی و قلمی جہاد پر اکتفا نہیں کرتے تھے، عہدِ طالب علمی میں گاؤں کے مردوں اور عورتوں کو جمع کرتے، اور انھیں سادہ اسلامی عقائد کی تلقین کرتے، مواعظ میں قرآن کریم سے زیادہ استفادہ فرماتے،

"اس کے علاوہ ابن حجر الہیتمی[۱] کی کتاب (الزواجر عن اقتراف الکبائر) سے بہت مدد ملتی تھی، یہ کتاب ان کی تمام تصنیفات پر بھاری ہے، مجھے اسی سے پہلے پہل معلوم ہوا، کہ قبروں کی تعمیر و تزیین اور ان پر چراغ روشن کرنا "بدعت و ضلالت" میں داخل ہے، جس کے مرتکبین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، بعض فقہاء سے ہدم قباب منقول ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں"، (ص ۱۰۴)

امام رشید کے گاؤں میں بھی قبریں تھیں، ان پر چراغان بھی ہوتا تھا، مرحوم نے اس کے روکنے کی پوری کوشش کی، اور ایک حد تک کامیاب ہوئے، آس پاس کی آبادیوں میں بھی ان توہمات کا زور تھا، مرحوم نے ان سب کا قلع قمع کر دیا، (ص ۱۰۵)

"یہ سب عہدِ طالب علمی کی باتیں ہیں، اس وقت تک امام مجدد شیخ الاسلام ابن تیمیہ[۲] یا ان کے شاگرد ابن القیم[۳] کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری تھی، بلکہ ابن حجر[۳] کی فتاوی حدیثیہ میں ان کے خلاف بہت کچھ پڑھ چکا تھا، اور اسے صحیح خیال کرتا تھا، پھر طرابلس[۴] میں مشہور مفسر شہاب محمود[۵] آلوسی بغدادی کے بیٹے علامہ خیرالدین آلوسی کی (جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین) دیکھی، تو معلوم ہوا، کہ ابن تیمیہ کا مرتبہ ابن حجر ہیثمی سے کہیں بلند ہے، پھر یہ راز کھلا، کہ ابن تیمیہ پر طعن و

---

[۱] متوفی ۹۷۴ھ، [۲] امام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ، امام ابن قیم متوفی ۷۵۱ھ، [۳] ابن حجر الہیثمی [۴] شہر طرابلس مقصود ہے، مرحوم پہلے قلموں میں رہا کرتے تھے، [۵] شہاب محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ [۶] خیرالدین آلوسی متوفی ۱۳۱۷ھ،

تیشنیع کے باوجود ان کی کوئی کتاب ہیتمی کی نظر سے نہیں گذری تھی، صرف انھیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ امام ابن تیمیہ متکلمین کی طرح آیات صفات کی تاویل نہیں کرتے، نیز ابن عربی، ابن فارض، ابن سبعین عفیف الدین تلمسانی اور رومی جیسے قائلین وحدۃ الوجود کی مخالفت اور تردید میں ان کا لہجہ سخت ہے، ابن حجر ہیتمی کو صوفیوں کی محبت میں بہت غلو تھا، ابن عربی سے بھی انھیں بہت عقیدت تھی، اشعری اور مقلد ہونے کے باعث ائمہ سلف اور محدثین کے برخلاف متکلمین کی طرح آیات صفات کی تاویل کرتے تھے، اصل یہ ہے، کہ انھیں حدیث اور آثار سلف کا کافی علم نہیں تھا، خیر الدین آلوسی نے اپنی مندرجۂ بالا کتاب میں دونوں (ابن تیمیہ اور ہیتمی) کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہے۔

وہابیوں کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، سنی سنائی باتیں کان میں پڑی تھیں کہ لوگ کہتے تھے کہ وہابی مبتدع ہیں، مسجد نبوی میں انھوں نے اپنے گھوڑے باندھے ... انکے متعلق کوئی سچی بات سب سے پہلے شیخ عبد الباسط فاخوری کی کتاب (تحفۃ الانام مختصر تاریخ الاسلام) میں نظر سے گذری، ان کی تاریخ سے تفصیلی واقفیت قیام مصر کے بعد ہوئی۔" (ص ۶۔ ۱۰۵)

یہ اس دور کے مجاہد اعظم کی مجاہدانہ زندگی کا آغاز تھا، یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں، جب مرحوم مصر نہیں آئے تھے، طرابلس کا ماحول ان کے مناسب نہیں تھا، دوستوں کے مشورہ سے مصر کا قیام اختیار کیا، اور چالیس سال تک مسلسل اعلاے کلمۃ اللہ میں مشغول رہے، ان چہل سالہ کارناموں کی تاریخ لکھنا، دنیاے اسلام کی تمام دینی وسیاسی تحریکوں کی تاریخ لکھنے کی کوشش کرنا ہے،

طلبۂ علم کے لئے سبق صاحب سیرت نے یہ آپ بیتی حالات سے مجبور ہو کر لکھی تھی، ازہر کی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں شیخ محمد عبدہ کی طرح انھیں بھی بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی، مرحوم نے اپنی برأت کے سلسلہ میں یہ صفحات سپرد قلم کئے تھے، پھر بھی حق الامکان "خود ستائی" سے قلم پاک رہا ہے، مرحوم نے

اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے بہت زیادہ، مشہور عرب لیڈر عبد الحمید زہراوی (جنھیں ترکان احرار کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا) آج سے پچیس سال پیشتر لکھ چکے تھے،[1] زہراوی کی ستائش سند کی حیثیت رکھتی ہے، امیر شکیب ارسلان بھی صاحب سیرت کی زندگی میں ان کے متعلق اتنا کچھ لکھ چکے ہیں، کہ آج بھی اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، یہ تو خیر اپنوں کی قدر شناسی تھی، غیروں میں مسٹر چارلس آدمس امریکن عالم و مستشرق نے اپنی کتاب (Islam and Modernism in Egypt)[2] صاحب سیرت کے انتقال سے کچھ ہی پہلے لکھی تھی، جس میں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے علاوہ المنار اور صاحب المنار کا تذکرہ مفصل اور شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے، کہنا یہ ہے کہ صاحب سیرت مدح وستایش کے بھوکے نہیں تھے، انھون نے یہ اوراق اصلاح اور دوسرون کی عبرت کے لئے مرتب فرمائے تھے، خود ان کی ترتیب و استنتاج کے مطابق اس "آپ بیتی" سے مندرجۂ ذیل اہم سبق ملتے ہین :-

۱- مدارس میں زیادہ مدت تک تعلیم حاصل کرنا مفید نہیں۔ اصل یہ ہے کہ دینی اور ادبی علوم کی تحصیل میں زیادہ وقت صرف کرنے سے غور و فکر کی قوت کمزور ہو جاتی ہے، اور طالب علم کا علم کتابوں کے اندر محدود ہو کر رہجاتا ہے، مرحوم کی سند میں، شیخ حسین جسر نے تحریر فرمایا تھا، کہ انھون نے کل آٹھ سال تعلیم حاصل کی ہے، اور اس اثناء میں بھی وہ دوسرے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا،

مدرسوں میں زیادہ عرصہ تک وقت ضائع کرنے سے، ذہانت اور قوت فکر کو جو صدمہ پہنچتا ہے اسکے متعلق امام شیخ محمد عبدہ کی ایک دلچسپ اور سبق آموز رائے سننے کے قابل ہے،

---

[1] زہراوی کی تحریر غالبًا "المؤید" میں شائع ہوئی تھی، [2] الاسلام و التجدید فی مصر کے نام سے اس کا عربی ترجمہ بھی ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا ہے،

مشہور سیاسی مفکر و مصلح شیخ عبدالعزیز شاویش جب پہلے پہل یورپ سے پڑھ کر واپس آئے تو سید رشید رضا مرحوم نے شیخ محمد عبدہؒ کی خدمت میں عرض کی، کہ شاویش کو اپنی مخصوص جماعت کا رکن بنا لیا جائے، محمد عبدہ نے فرمایا، کہ "انھوں نے یورپ میں کیا پڑھا ہے"؟ شاگرد رشید نے کہا "ابھی تو دریافت نہیں کیا، لیکن وہ پرجوش اور ذہین نوجوان ہیں"، استاذ کا ارشاد ہوا "اچھا تم از کم یہ دریافت کرو کہ انھوں نے مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ سے پہلے ازہر میں کتنی مدت گذاری تھی؟ اگر دو چار سال سے زیادہ وہ ازہر میں رہے ہوں گے، تو یقین مانو ان کی ذہنی صلاحیتیں خراب ہو چکیں اور جہل باقی رہ گیا" (ص ۳۵-۱۳۴)

۴۔ خلوص نیت اور مقصد کی تعیین:- طالب علم کی کامیابی کے لئے نیت کی پاکیزگی، اور مقصد کی تعیین ضروری ہے، صاحب سیرت عہد طالب علمی اور اس کے بعد اپنے مقصد حیات کو کبھی نہیں بھولے، دنیاوی جاہ و ثروت کے آگے کبھی ان کا سر خم نہیں ہوا، دین کی خدمت اور قوم کی اصلاح ان کی زندگی کے خاص مقاصد تھے، اور وہ اس راستہ سے کبھی الگ نہیں ہوئے، ازہر اور علماے ازہر سے سید رشید کو بڑی شکایت یہی تھی، کہ انھوں نے طلب جاہ کی خاطر اپنا اصلی مقصد پس پشت ڈال دیا،

صاحب سیرت کا پختہ عقیدہ تھا کہ طالبین جاہ و ثروت اور علماے سو کے مقابلہ میں دنیا اور اسکی قومیں مجاہدین اور علماے ربانیین کے سامنے زیادہ جھکتی ہیں، اللہ کے بندے دنیاوی آسایش و راحت پر دائمی خوشی اور ابدی کامرانی کو ترجیح دیتے ہیں، شیخ محمد عبدہ کہا کرتے تھے "اگر ازہر کی اصلاح کی توقع نہ ہوتی، تو میں حکومت کا عہدہ کبھی قبول نہ کرتا" ان کی زبان سے یہ بھی بارہا سنا گیا، "اگر میں مالدار بننا چاہتا، تو دنیا کے بڑے سرمایہ داروں میں آج میرا شمار ہوتا" (ص ۱۳۶)

عاجز کا تو یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ خاص میں سید رشید رضا اپنے استاذ سے بھی سبقت لے گئے تھے، اور اسی لئے اس مقام پر اہل ازہر کے متعلق ان کا قلم بہت تیز ہو گیا ہے،

۳۔ ترک تقلید و اجتہاد فکر:- سید رشید آغاز عہد طلب سے استقلال فکر کے پرجوش حامی ہے، وہ کوئی مسئلہ بلا دلیل قبول نہیں کرتے تھے، یہ روش ان کی آخری عمر تک قائم رہی، اسی لئے علم حدیث اور اسکی مختلف شاخوں میں ان کا پایہ اتنا بلند ہوا، ہم طلبہ علم کو نصیحت فرماتے ہیں:-

"اے طالب مسلم! خوب ذہن نشین کر لے، فقہ میں جس چیز کو اجتہاد سے تعبیر کرتے ہیں، خواہ اجتہاد مطلق ہو، یا کسی ایک مذہب کے اندر، اس کا مرتبہ احکام شرعیہ کے استقلالی علم سے کہیں بلند ہے، میں تو تم کو مسائل کی چھان بین میں صرف ذاتی فہم پر اعتماد اور سوچ سمجھ کر (اقتناع) آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہوں، یہ علم کا ادنیٰ درجہ ہے، اس کے بغیر تمھیں کسی فن کا صحیح علم نہیں حاصل ہو سکتا، اگر استقلال فہم کو بھی چھوڑ بیٹھے، تو پھر تم "جہل مطلق" یا "جہل تقلیدی" کے درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے ...... ان لوگوں کی تقلید ہرگز نہ کرنا، جو یہ کہتے ہیں کہ بعض علوم پہلے علماء پر ختم ہو چکے، اور پچھلوں کے لئے صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ بلا سوچے سمجھے ان کی ہر بات مان لیا کریں"۔

علوم کی ہمہ گیری (الاحاطۃ بالعلم) اللہ کی صفت ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (رب زدنی علماً) کہنے کا حکم ملا، انسان کی لکھی ہوئی کوئی چیز کامل اور آخری نہیں ہو سکتی، علم حدیث کی شاخوں میں جرح و تعدیل، اور "نقد رجال" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں"۔ (صفحہ ۱۳۷)

۴۔ علم صحیح کی نشانی:- آخری صدیوں میں جہاں بہت سے عیوب اہل علم میں آگئے وہاں ہٹ دھرمی، اور اپنی رائے پر (غلط یا صحیح) اصرار بھی ہے، سید رشید علماء کے اس عیب کے خلاف سختی سے متنبہ کرتے ہیں، مباحثوں اور قلمی مناظروں میں وہ خود بھی اپنی غلطی کے اعتراف میں خفت محسوس نہیں کرتے تھے، سید رشید کی رائے میں صحیح علم کی نشانیاں یہ ہیں:-

جہل کا احساس، نقص کا اعتراف، زیادتی علم کی ضرورت، ہر چیز سے استفادہ کی خواہش اور عقل و فہم کی مزید تربیت و تشقیف کی حاجت" الخ

راقم الحروف نے اپنے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی شخصیت میں ان نشانیوں کی سچی تصویر دیکھی ہے، حدیث، ادب و لغت اور مختلف علوم میں اعلیٰ دستگاہ کے باوجود وہ آج تک سچے طالب علم ہیں، کسی استفسار کے جواب میں "لا ادری" یا "لیس عندی فیہ تحقیق" کہنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں، استاذ ممدوح بھی امام مرحوم کے ہم مشرب اور خاص دوستوں میں تھے، شاید یہ انہی کا فیض ہو، (باقی)

پیام تعلیم (باتصویر) سال گرہ نمبر ۱۹۳۸ء

پیام تعلیم کے سالناموں نے بچوں کے رسالوں میں ریکارڈ قائم کر دیا ہے، ان سالناموں کو بچے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس سال کا سالنامہ ہم اور بھی احتیاط سے نکال رہے ہیں، اب کی اس میں زیادہ تر مضامین مشغلوں پر ہوں گے، یہ مشغلے اس قدر دلچسپ ہوں گے، کہ بچوں کا پورا سال نہایت دلچسپی سے کٹے گا، اور دلچسپی ہی دلچسپی میں وہ بہت کچھ سیکھ جائیں گے، اس میں فوٹو کی تصویروں کے علاوہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں بھی بیشمار ہوں گی، ان دنوں ہمارے طرز تعلیم میں جو انقلاب ہوا ہے، اس کے اعتبار سے یہ استادوں کے لئے بھی رہنما کا کام دے گا، آپ اپنے بچوں کے لئے ضرور منگوائیے، قیمت صرف :- ۸/

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ،

"منیجر"

آخری شاہان تیموریہ کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب رفیق دارالمصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۴)

مشکل پسندی مگر ظفر کا زور طبع اور کمال فن اس وقت نظر آتا ہے، جب وہ نہایت مشکل اور سنگلاخ ردیف اور قافیے اختیار کرتا ہے، اسکی مثالیں اس کے دیوان میں اس کثرت سے ہیں، کہ اس مضمون کے محدود صفحے ان کے متحمل نہ ہو سکیں گے، گو سخن شناسی کا تقاضا تو یہی تھا، کہ اس نے جتنے مشکل قوافی میں طبع آزمائی کی ہے، اور جن سنگلاخ زمینوں میں جولانیاں دکھائی ہیں، ان سب کی داد دل کھول کر دی جاتی، مگر ہم تھوڑے سے اشعار پر اکتفا کرتے ہیں، قوافی کی مثالیں :

پارۂ ساغر و شیشہ نہیں ابرک کے ورق ساقیا کیونکر کہوں شیشے کو عینک کے ورق

یوں ہیں لخت دل سیپارۂ مژہ اشک کے ساتھ جیسے قرآن سے ہو ہاتھ میں کودک کے ورق

اس غزل میں چمک کے ورق، زردک کے ورق، چشمک کے ورق، مشک کے ورق، پلک کے ورق وغیرہ بھی قافیے ہیں،

ٹکڑے خاک پہ دلہا ی پاش پاش کے پھینک جو پھینکیے بھی تو سر راہ اپنی کاش کے پھینک

ہلال عید فلک پر ہو منفعل کیا کیا، زمین پہ ناخن پا تو جو دے تراش کے پھینک

پاش کے پھینک، تلاش کے پھینک، خراش کے پھینک، معاش کے پھینک، تماش کے پھینک کو بھی استعمال کیا ہے،

ترے بیمار غم کا حال ہی یہ ناتوانی سی کہ اُس نے آج بستر پر ذرا کروٹ نہین بدلی

بقیہ قوافی نٹ کھٹ نہین بدلی، پٹ پٹ نہین بدلی، چوکھٹ نہین بدلی، جھٹ پٹ نہین بدلی، اٹ سٹ نہین بدلی، وغیرہ،

دل جل گیا ہمارا جگر بھن گیا تمام الفت تمھاری شعلہ رخو بھاڑ مین پڑے

کھڑکاڑ مین پڑے، تاڑ مین پڑے، چوپاڑ مین پڑے، ہڑواڑ مین پڑے، بوچھاڑ مین پڑے، دھاڑ مین پڑے وغیرہ،

یہ خانہ باغ ہے موجود سینۂ پرداغ جو سیر دیکھے تو وہ دل کی شہ نشین پہ ٹکے

زمین پہ ٹکے، انگبین پہ ٹکے، آتشین پہ ٹکے، مہ جبین پہ ٹکے، نگمین پہ ٹکے، یاسمین پہ ٹکے وغیرہ

اسی طرح مختلف سنگلاخ زمینون مین ظفر نے جو زور طبع دکھایا ہے، وہ خاص اسی کا حصہ ہے، وہ نئی نئی زمینین نکالتا تھا، اور ان مین اشعار کہکر اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتا تھا، اس کے معترف مولینا محمد حسین آزاد بھی ہین، جو ظفر کے تمام کلام کو ذوق کے خوان شاعری کی محض زلہ ربائی سمجھتے ہین، وہ بادل ناخواستہ رقم طراز ہین کہ ظفر شاعری مین طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ تھا،

اس کی ان جدتون کے نمونے بھی اس قدر زیادہ ہین، کہ اس کا ایک ایک شعر بھی نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، کچھ نمونے ملاحظہ ہون، خط کشیدہ قوافی مین پوری پوری زمین ہین،

جو درد ہوتا تو غل مچاتا جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہی نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

ہم اپنا عشق چمکائین تم اپنا حسن چمکاؤ کہ حیران دیکھ کر عالم ہمین بھی ہو تمھین بھی ہو

زبان مین ہو اثر میری تو شاید دل پھرے اس کا اگر ناصح دعا دل سے کوئی یون ہو تو یون بھی ہو

بجز رونے کے ہان چشم عنایت ہو تو کیونکر ہو کہ بے اشک ندامت جوش رحمت ہو تو کیونکر ہو

رباب و چنگ ہو بزم طرب ہو اور مطرب ہو دف و نے ہو، دل ہو پھر تو جیسی ہو تماشا ہو

کس سے انھوں نے مہر و وفا کی جس سے لیا دل اس سے دغا کی ان سے ہو کیا امید کرم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہونگے

شرارہ سے کہتے تھے شعلے شب کو نالون کے کہ جھگے چرخ پر اختر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

نہین گل تن پہ عشق دلربا مین پھول کرتے ہین تماشا ہم نے یہ رنج و بلا مین پھول کرتے ہین

غم نہین ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہین ہم ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہین تو کچھ نہین

خالی نہین خلش سے محبت کے کوئی بھی یارو کھٹکتی جان مین یہ گل کی پھانس ہے

ظفر کی طبیعت کو مشکل زمینون مین جولانی دکھانے مین خاص مناسبت تھی، وہ خود کہہ گیا ہے کہ

دل اپنا فکر غزل مین ظفر نہین لگتا زمین غزل کی نہ ہووے اگر انوکھی سی

اور اس مشکل پسندی کو وہ اپنا امتیاز سمجھتا ہے،

زمین سہل مین تو ہین سبھی کچھ شعر کہہ لیتے ظفر لکھتے غزل جو ایسی مشکل ہین تو آپ ہی ہین

ایک دوسری جگہ کہتا ہے،

ظفر مشکل پسندی تیری سب اب کس کو آتی ہے سخنور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے

ایک جگہ تو چیلنج دیتا ہے،

ظفر ان قافیون مین کہہ نہیں سکتا غزل کوئی اگر کہتا بھی ہے تو تجھ سے اصلاح غزل لے

ظفر کی یہ تعلی ایک حد تک بجا ہے، اس کے ہمعصر شعرا مین سے کسی نے بھی ایسے سنگلاخ

قافیون، ردیفون اور زمینون مین غزل نہین لکھی ہے، انشا اور شاہ نصیر کے یہان اسکی مثالین ملتی ہین، مگر اتنی نہین،

ظفر اور اساتذۂ فن

ظفر کا زور طبع اسی پر ختم نہین ہوتا، بلکہ ریختہ کے جتنے باکمال شعرا گذرے ہین، ان کی غزلون پر غزلین کہی ہین، ان کی بعض مثالین ملاحظہ ہون،

میر — فائدہ مصر مین یوسف رہے زندان کے بیچ
بھیج دے کیون نہ زلیخا اسے کنعان کے بیچ

ظفر — دم مین دم میرے نہیں جان نہین جان کے بیچ
زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کے ترے کان کے بیچ

درد — دیکھیے جسکو یان اوسکا اور ہی کچھ دماغ ہے
کرمک شب چراغ بھی گوہر شب چراغ ہے

ظفر — دنیا فروغ دل مین محبت کا داغ ہے
رہتا بغیر داغ یہ گھر بے چراغ ہے

انشا — بنا کے چھوڑ دون جو افیون کا شراب مین نشا
تو صاف آوے نظر جرم آفتاب مین نشا

ظفر — اگر شراب کی موجین بنین شراب مین نشا
خط شعاع سی لہرائین آفتاب مین نشا

مصحفی — سر رشتہ کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

ظفر — دیکھے جو ہمارے بت مغرور کی گردن
غلمان کے تن سی ہو جدا حور کی گردن

آتش — ذرہ خورشید ہو پہونچے جو دریا کے پاس
سایہ بن جائے ہما لوٹ کے دیوار کے پاس

ظفر — آبلہ سینہ پہ ہے میرے دل زار کے پاس
یا کہ شیشہ سا دھرا ساقی سرشار کے پاس

ناسخ — ایک شب جو تیری محفل مین نہ پائی بار شمع
صبح ہوتے ہوتے ہو مانند رشتہ زار شمع

ظفر — دریا بہائے گر مژہ اشک بار شمع
تو بھی نہ بجھے نہ سوز دل داغدار شمع

شیفتہ — دن سے یہان آنے کی تدبیر ہے،
کیا اثر نالۂ شب گیر ہے،

ظفر — شوق خار دشت دامن گیر ہے
اور مجنون پائے در زنجیر ہے

غالب کا طرز بیان اور ان کی نکتہ آفرینیان اپنی جگہ پر لیکن ایک ہی قافیہ اور ردیف

مین ظفر نے اپنے استاد کی تقلید مین جو اشعار کہے ہین، وہ بھی ذرا سن لیجیے،

غالب	ظفر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو	کیا ذکر کچھ کلام مین واعظ کے ہو مزا
بنتی نہین ہے بادہ و ساغر کہے بغیر	محفل مین وصف بادہ و ساغر کہے بغیر
سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہو گئین	واہ اس صورت کدہ مین دیکھتے ہی دیکھتے
خاک مین کیا صورتین ہون گی جو پنہان ہو گئین	صورتین کیا کیا نظر سے اپنے پنہان ہو گئین
وہ نگاہین کیون ہوئی جاتی ہین یارب دل کے پار	جس سے چار آنکھین تری اے آفت جان ہو گئین
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگان ہو گئین	تیر سی اسکے جگر کے پار مژگان ہو گئین
نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتین اسکی ہین	اے ظفر دل کی پریشانی کا ہے میرے اثر
تیری زلفین جس کے بازو پر پریشان ہو گئین	یہ جو اس کافر کی زلفین ہین پریشان ہو گئین
اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ	یہان تک ہے ذوق دشت نوردی کہ نکال
ہلتے ہین خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤن	ہین اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پاؤن

مومن کی ایک غزل کا مطلع ہے،

نامہ رونے مین جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ
کہ بنا ہم گہر صفحۂ دریا کاغذ،

ظفر نے قافیہ کے تغیر کے ساتھ اسی ردیف مین کئی غزلین کہی ہین،

جوش گریہ کا برا ہو کہ ترے نامہ کو
دیا آنکھون سے بھی ہم کو نہ لگانے کاغذ

دل بیتاب کو تسکین ہو کیا قاصد کی باتون سے
نہ آئے جب تلک اس یار کی تحریر کا کاغذ

ظفر سے متقدم اور اس کے معاصر شعرا کی غزلون کے مقابلہ مین جو اسکی غزلین نقل کی گئی ہین ان کا ہرگز یہ منشا نہین کہ

ظفر تیرے سخن کے روبرو کسکا سخن چکے — سخن کی تاب و طاقت ہی نہیں رہتی سخندان میں

یا :-

سخنوری میں ظفر کون تم سے ہو ہمسر — خدا نے ہے تمھیں دل و دماغ دیا،

بلکہ صرف اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ

ظفر کہتے ہیں ہم بھی وضع استادانہ رکھتے ہیں

ظفر و میر | اوپر غزل کے ظواہر میں باکمال شعرار کے کلام کے مقابلہ میں ظفر کی طبع آزمائی دکھائی گئی ہے، معنوی حیثیت سے بھی اس کے کلام میں مختلف اساتذہ کا رنگ پایا جاتا ہے، میر کے رنگ میں کہتا ہے،

تیرے جس دن سے خاک پا ہیں ہم — خاک ہیں لیک کیمیا ہیں ہم،

تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید، — کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم

ہم ہیں جوں زلف عارض خوبان — گو پریشان ہیں خوشنما ہیں ہم[1]

یہ کراہا تیرا بیمار الم درد کے ساتھ — کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا

میں وہ مجنون ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو — میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

بالیں پہ اس کے شور مچاؤ نہ ہمدمو — نازک بہت ہے عشق کے بیمار کا دماغ

یہاں تک روئے جدائی میں تری دن رات ہم — اشک کی جا چشم سے لخت جگر پیدا ہوا

میر کے طرز پر چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں لکھی ہیں مثلاً

[1] اسی قافیہ اور ردیف میں میر کی غزل کا مطلع ہے،

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم، — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم،

میر کی اس غزل پر ظفر نے مخمس بھی لکھا ہے، جو اس کے دیوان جلد اول صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ ہو،

گور کنج فراغ ہے اپنا — داغ اپنا چراغ ہے اپنا،

کون کنج حزن میں ہو مونس — ایک دل سوز داغ ہے اپنا،

درد دل درد آشنا جانے — اور بے درد کوئی کیا جانے

ہو نمک سود گر نہ زخم جگر — دل محبت کا کیا مزا جانے

میر اور ظفر کے ملتے جلتے ہوئے مضامین،

میر: کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ — اک سارے تن بدن میں مرے پھک رہی ہے آگ

ظفر: داغ دل میں آگ لخت دل میں چشم تر میں آگ — عشق کی سوزش سے ہے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ

میر: جل جل کے سب عمارت دل خاک ہو گئی — کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ

ظفر: ہو گیا میں خاک جل کر پڑ رہی ہے سوز دل — اپنے دامن کو بچا ہے میری خاکستر میں آگ

میر: یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں — یہ کیسے عاشقوں کے دلوں میں رکھی ہے آگ

ظفر: جی جلاتی ہیں کیوں نہ میرا یہ بتان سنگدل — دل ظفر ان کا ہے پتھر اور ہے پتھر میں آگ

میر: اللہ ری عندلیب کی آواز دلخراش — جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل

ظفر: آجائے گر ہوائے گلستان قفس تلک — بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہکر کہ ہائے گل

میر: تیری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہ کہاں کھویا — جگر خون کشتہ دل آزردہ میرا اس خانہ ویران کو

ظفر: تجھے دل دے کے میں آ کا فریب میں کھو بیٹھا — خرد کو ہوش کو طاقت کو جی کو دین و ایمان کو

ظفر میر کے رنگ میں خود میر صاحب کی روح سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے،

یہ غزل پڑھتے اگر بزم سخندان میں ظفر — کیونکہ تحسین کے لئے پھر نہ سر میر ہلے،

ناسخ و ظفر | ظفر کی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ وہ متضاد رنگ میں کامیاب طبع آزمائی کرتا ہے، ناسخ اور میر کا اختلاف ذوق ظاہر ہے، مگر میر کے بعد جب وہ ناسخ کے رنگ کی طرف متوجہ

ہوتا ہے تو وہ رند مشرب عاشق بن جاتا ہے، اور اس کوچہ کا بھی ویسا ہی کامیاب رہ نورد نظر آتا ہے، مثلاً

کرتا ہے قتل وقت جواب سخن مجھے
ہنس دینا ان کا اور نہ کہنا حجاب سے

اللہ رے شرم آئے جو وہ شب کو خواب میں
پنہاں رکھا حجاب سے منہ کو نقاب میں

کبھی افسوس وہ اور ہم نہ محفل میں بہم بیٹھے
جو ہم اٹھے تو وہ بیٹھے جو وہ اٹھے تو ہم بیٹھے

وصل کی رات نہ باتوں میں گذارو ساری
بس گلے ہو چکے گر ہیں تو سحر پر رکھو

جس کو سمجھے لب پان خوردہ مالیدہ مسی
مردمان دیکھئے بھولی وہ کہیں شام نہ ہو

ہے ڈوپٹہ سرخ جو وہ رشک گل اوڑھے ہوئے
باغ میں گل برقع خجلت میں گل اوڑھے ہوئے

گلوں کے ہونگے گریبان چاک گلشن میں
رہیں گے بند قبا تیرے گر کھلے کے کھلے

نہیں ہے سرخ وہ موباف جعد مشکین پر
بغور دیکھ ظفر ہے بہار شام شفق

جھلک رخسار آتشناک کی بجلی سی کوندی ہے
ہوا کے جھوکے اس عزفی پر جب چلمن ہلاتے ہیں

یہ معاملہ بندی جس طرح ناسخ کے یہاں اعتدال سے بڑھ کر رکیک وسخیف بن گئی ہے، اسی طرح ظفر کے یہاں بعض اوقات بہت ہی مبتذل ہو گئی ہے، مگر اس قسم کے خارجی مضامین میں ناسخ کے ساتھ طبع آزمائی کر کے ظفر اپنی تخییل نگاری اور مضمون بندی کا بھی ثبوت دیتا ہے، مثلاً،

ناسخ — کیا اثر پھیلا ہے تیرے روئے آتشناک کا
صورت مجمر ہے دیوار چمن کے ہر روزن میں آگ

ظفر — حلقۂ زلف میں ہے اس کا رخ آتشناک
لچۂ حسن کی روشن ہوئی گرداب میں آگ

ناسخ — اسقدر سوزش ہے اے جراح میرے زخم میں
لگ اٹھیگی دم میں تنکے کی طرح سوزن میں آگ

ظفر — ہے شرار اشک خون سے چشم طوفان زا میں آگ
عشق کی گرمی سے دیکھو لگ گئی دریا میں آگ

ناسخ — میری آنکھوں سے اگر لخت دل سوزاں گرے
بولے ہمدم دیکھئے ہے آپ کے دامان میں آگ

ظفر — تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکے اشک گرم
کیا تعجب گر لگا دے دامن صحرا میں آگ

آتش وظفر — اسی طرح آتش کے ساتھ طبع آزمائی کرتا ہے،

آتش — مے نے کئے عذار بت شوخ و شنگ سرخ
کندن کا اور آگ میں ہوتا ہے رنگ سرخ

ظفر — کب چشم سرمہ سا ہے تری مست خواب سرخ
اس جام نیلگوں میں ہے رنگ شراب سرخ

آتش — دل دوستی بت کا نہ پابند ہو یارب
دشمن کا بھی دب جائے نہ پتھر کے تلے ہاتھ

ظفر — فرہاد دبا آتا ہے اس عشق سے شیریں
پر کیا کرے جو دب گیا پتھر کے تلے ہاتھ

آتش — تبدیل شب وصل سے ہو روز جدائی
بالش کے عوض ہو سر دلبر کے تلے ہاتھ

ظفر — ہے جی میں تمنا یہ کہ سوتے ہیں تو گاہے
آجائے مرا عارض دلبر کے تلے ہاتھ

آتش — مستی میں طلبگار تو ساقی سے ہے مے کا
کاٹوں گا میں کانپے گا جو ساغر کے تلے ہاتھ

ظفر — دل ہاتھ میں اس کا لیا پر ہے یہ ظفر حال
جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ

آتش — پاؤں کو ان کے چھوا میں نے تو ہنسکر بولے
کاٹے جاتے ہیں تو ایسے ہی گنہگار کے ہاتھ

ظفر — میں نے چوری سے جو شب زلف کو چھیڑا تو کہا
کاٹنے چاہئے اس دزدسیہ کار کے ہاتھ

آتش — کرتا ہے ناز وہ شہ خوبان نئے نئے
آئین تازہ تازہ ہیں فرمان نئے نئے

ظفر — ناز و ادا و غمزہ تو ہیں شیوۂ قدیم
انداز ان کے اور ہیں اکثر نئے نئے

آتش — رخسار خط نکالے گا اس شاہ حسن کا
پیدا کرے گا مور سلیمان نئے نئے

ظفر — آغاز خط سے کیا ہی نکالے ہیں دیکھنا
طوطی باغ حسن نے یہ پر نئے نئے

آتش — خاک چھنوا رہی ہے کوچۂ قاتل کی تلاش
ساتھ اپنے خراب اپنی قضا پھرتی ہے

ظفر — دے کے دل قاتل بے رحم کو پھرتے ہیں کیونکر
کہ نہ تقدیر پھرے ہے نہ قضا پھرتی ہے

اور کہین کہین تو زورِ بیان مین ظفر آتش سے سبقت لیجاتا ہے، مثلاً

آتش — پھوٹا نحد مین دل کا پھپھولا تو دیکھنا / ہو جائے گا مزار کا آتش کے سنگِ سرخ

ظفر — خون جوش مین ہو تیرے شہیدون کا زیرِ خاک / نکلا زمین کے پردے سے جو آفتاب سرخ

آتش — سوزشِ دل کا بیان کچھ کیا تھا اُنکو / موم ہو کر بہ گئی سُن کر مرا افسانہ شمع

ظفر — دریا بہائے گر مژہ اشک بارِ شمع / تو بھی بجھے نہ سوزِ دلِ داغدارِ شمع

آتش — داغِ دل کی روشنی کافی ہو آتش گور مین / غم نہیں اس کا نہ ہوا پنے سرہدفن چراغ

ظفر — اس دل جلے کو چاہو کیا گور کا چراغ / ہے داغِ دل ہی کشتۂ رنجور کا چراغ

آتش — کٹواتی ہو سرشمع جو ثابت قدمی سے / آنسو بھی نہ اندیشۂ گلگیر سے ٹپکے

ظفر — ہراک آنسو کا قطرہ ہو جو دانہ کہربا کا سا / دمِ گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

آتش — جوشِ جنوں نے گو کہ مجھے زرد کر دیا / چہرے کو میرے رکھتے ہین لڑکے ٹنگ سرخ

ظفر — ہے میرے اشکِ خون سے ظفر راہِ عشق مین / ہر سنگ ریزہ صورتِ لعلِ خوش آب سرخ

سراپا نگاری

سراپا نگاری کا جتنا مکمل نمونہ ظفر کے یہان ہے، وہ کسی اور شاعر کے یہان نہین معشوق کے اوصاف ولوازم کی قلمی تصویر کھینچنے مین اس نے پوری پوری غزلین کہی ہین، جن مین زیادہ تر رنگ تو ناسخ و آتش کا ہے، لیکن بعض اوقات زبان کی سادگی، بیان کی بے تکلفی، اور خیالات کی برجستگی مین ظفر ناسخ و آتش سے بڑھ جاتا ہے، مثلاً ظفر زلفِ یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دیتا ہے،

کھول کر زلفِ سیہ اس نے جو دیکھا آئینہ / صاف دریا پر نظر کالی گھٹا سی آگئی

کھول دی اس نے عرق افشان جو وہ زلف دراز / کیا زمین سے جھوم کر بدلی برسنے لگ گئی

زلف کو کھول کے آئینہ جو دیکھا تو نے / رنگ بدلی نے بھی کیا کیا لب جیحون بدلے

ڈھانپ لے منہ کو قمر سے دہن ہاں اے سحاب / تیرے عارض پہ اگر زلفِ گرہگیر ہلے

زلف اس رخ سے جو سرکی تو یہ سوجھا شب کو / اے ظفر مہ نکل آیا جو گئی ہٹ بدلی

آتش اور ناسخ نے بھی زلفِ یار کو کالی گھٹا سے تشبیہ دی ہے، مگر ان کے یہان صرف ایک ایک شعر ملا،

آتش — کم نہین کالی گھٹا سے یار کی زلفِ سیاہ / دیکھ لے طاؤس کافر کو تو چلانے لگے

ناسخ — ہمیشہ رہتی ہین زلفیں عذارِ تابان پر / عجب ہے چاند کہ ہوتا نہیں سحاب جدا

زلفِ یار کی ناگن، سنبل اور زنجیر سے تشبیہیں آتش، ناسخ، اور ظفر کے یہان بکثرت ہین، مگر مندرجہ ذیل اشعار ظفر کی ندرتِ تخییل اور جدّتِ طبع کا نتیجہ ہین، جو ناسخ اور آتش کے یہان نہیں،

زلف یون روئے عرق آلودہ پر لہرائے ہے / صبح جون ناگن گلون پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یون چہرے پہ ہلتی ہو ہوا سے اس کے / جس طرح مار سیہ کھائے ہو بل پانی کے بل

رُخ گلنار پر تیرے کہان ہو زلفِ خم گشتہ / بھم اے بحرِ خوبی حلقہ گرداب وآتش ہے

رُخ گلنار پر عرق گرا بر تر بن جائیگی / برق تو میری بھی آہ پر شرر بن جائیگی

ہٹا دو زلف کو تم مصحفِ رُخ سے غضب ہے یہ / کہ پھیلے سوے قران پاؤن اس کج طبع کافر کے

خدا محفوظ رکھے اس صنم کی زلف سے دلکو / کہ یہ سید ھا مسلمان اور وہ کج طبع کافر ہے

زلف اس روئے کتابی پر ظفر، / سورۂ واللیل ہے قرآن مین

مصحفِ رخسار پر کافر ترے گیسو ہین دو / ہے تماشا حافظ قرآن ہوئے ہندو ہین دو

لٹکی عجب انداز سے ہو رُخ پہ تری زلف / ایسا خط تعلیق مین بھی لام نہ پایا

خالِ رخ یار پر ظفر نے جو مضمون بندی کی ہے، وہ بھی آتش اور ناسخ کے یہان نہین، مثلاً

چشم مست بت مے نوش پہ یہ خال نہیں ۔۔۔ نیلو فر کا ہی دھرا ساغر لبریز پہ گل

خال ہے دنبالۂ چشم فسون گر کے تلے ۔۔۔ نیلو فر کا پھول ہو یا شاخ عنبر کے تلے

خال رخ پر زلف کج ہاں سر بسر جنبیدہ ہے ۔۔۔ شاخ سنبل نیلو فر پہ مگر جنبیدہ ہے

خال اب نہ تو زلف سیاہ فام دکھاؤ ۔۔۔ تارا مجھے مت ایک سر شام دکھاؤ

نہیں رخسار پر اس مہ جبین کے خال کاجل کا ۔۔۔ خدا جانے کہ یہ کن تیرہ بختوں کا ستارا ہے

خال رخ یار کا کشتہ ہون ۔۔۔ لایا گردش مین ستارا مجھے

دیکھے ہے خال رخ یار کو یون طرہ ول ۔۔۔ دانہ پر جیسے پڑے مرغ ہوا گیر کی آنکھ

سورۂ صاد ہے چشم اس کی کہ جس پر یہ ظفر ۔۔۔ خال سے کاتب قدرت نے بنایا مطلق

اے ظفر اس خال رخ پر بال زلفون کے نہیں ۔۔۔ من سواپنے ہین یہ کالے لہر کھا کر کھیلتے

یہ سیاہی سے لکھا مضمون خال رخ ترا ۔۔۔ ہے بیاض ماہ پر تنویر مین لکھا ہوا،

چشم یار کو ناسخ اور ظفر جام سے تشبیہ دیتے ہین، مثلاً

ناسخ ۔ کر دیا ہے یاد چشم و گردن جانان نے مست ۔۔۔ سامنے سے ساقیا اب شیشہ و ساغر اٹھا

ظفر ۔ ہم کو اس دور مین ہو کیون طلب ساغر سے ۔۔۔ یہ تو جب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو،

ناسخ ۔ چشم ساقی سے نہ کیون عشق ہو میرے دل کو ۔۔۔ کون شیشہ ہے بھلا جس کو نہین جام سے کام

ظفر ۔ مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی ۔۔۔ وہ چشم مست ساقی جام جم ہے،

قامت یار پر ناسخ آتش اور ظفر تینون نے طبع آزمائی کی ہے،

ناسخ ۔ کون ہے جو نہیں مرتا ہے تری قامت پر ۔۔۔ کیون نہ ہو سرو چمن قالب بیجان ہوتا

آتش ۔ سرو گڑ جائین گے گل خاک مین مل جائینگے ۔۔۔ پانوں رکھے تو چمن مین وہ سرفراز اپنا

ظفر ۔ صدقے اے رشک چمن اس قد موزون کے ہے ۔۔۔ سیدھا ایسا کوئی سرو چمنی ہووے تو ہو

نزاکت یار پر آتش و ظفر کی شاعرانہ تخئیل دیکھئے،

آتش ۔ وہ نازنین یہ نزاکت مین کچھ یگانہ ہوا، ۔۔۔ جو پہنی پھولون کی بدھی تو درد شانہ ہوا

ظفر ۔ کیا نزاکت ہو کہ گل عکس در گوش سے آہ ۔۔۔ یہ پڑا بوجھ کہ درد اس کے ہوا شانے مین

آتش ۔ نہ یہ نزاکت پری میں دیکھی نہ حور مین یہ نزاکت آتش ۔۔۔ جو ہار پھولوں کا اس نے پہنا تو بوجھ اٹھایا ہزار من کا

ظفر ۔ چہ شد اللہ رے نزاکت کہ اگر زلف کا عکس ۔۔۔ بوجھ ڈالے تو لچکتی وہ کمر اور بھی ہو

ناسخ اور آتش اپنی اپنی جگہ پر مسلم الثبوت استاد ہین، لیکن ظفر کے اشعار مین نمایان خصوصیت یہ ہے، کہ اس کے طرز بیان مین تکلف، تصنع اور آورد نہین، شاید اسی وجہ سے کہہ گیا کہ

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن مین استاد ۔۔۔ کیون نہ قائل ہون ترے ناسخ و آتش دونون

خاتمہ ظفر کی شاعری پر میری طویل خامہ فرسائی ناظرین کے لئے گران خاطر ہو رہی ہوگی، مگر یہ طوالت شاید اس کا ردعمل ہے، کہ ظفر جس نے ہزارون اشعار کہکر اپنے خون جگر کو کاغذ کے صفون پر بہایا ہے، عام طور سے یا تو ادنی درجہ کا شاعر یا ذوق کا محض زلہ ربا سمجھا جاتا ہے،

انصاف ہی جب اہل سخن مین نہ ہو ظفر ۔۔۔ چاہے سخن کی اپنی کوئی ان سے داد خاک

اسکی شہرت کو سب سے زیادہ نقصان مولانا محمد حسین آزاد سے پہونچا جنھون نے اس کے دیوان کے مجموعون کو "سرتاپا" ذوق کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ ایک زمانہ تک اہل نظر بھی اسکی شاعری کو ذوق کی کمائی سمجھکر قابل التفات نہیں سمجھتے تھے، لیکن ارباب بصیرت نے اصل حقیقت کو دکھا کر اس غلط فہمی کو دور کیا، اور ظفر ایک مستقل شاعر مانا گیا، پھر بھی غالب مومن اور ذوق کی آوازۂ شہرت کے سامنے اسکی شاعری دب گئی، اس کے علاوہ اہل ذوق کی طبیعتین بھی بدل گئین، غالب کی فلسفہ طرازی مومن کی بلند پروازی، اور دونون کی دلنشین فارسی ترکیبون کے سامنے ظفر کی سادگی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی،

ظفر کی شاعری مین غالب اور مومن کی معجز طرازیان نہ سہی لیکن قادر الکلامی کا دائرہ اتنا تنگ نہیں جس نے سوز و گداز اور حزن و ملال کا صحیح مرقع کھینچا، اخلاقی مسائل اور صوفیانہ نکات کو عام فہم بنایا، سادگی اور سلاست کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، قلعہ معلی کی زبان اور محاورات کو اپنی شاعری مین محفوظ کیا اور اپنے زور طبع سے پرانے اساتذۂ فن کی یاد تازہ کی، کیا اسکو ہم ایک قادر الکلام شاعر اور استاد نہیں کہہ سکتے ہین، ؟

سخن دان و سخن گویون تو دنیا مین ہزارون ہین
ظفر پر ہم نے تیری سی سخنگوئی نہین دیکھی

بے شبہہ اوسکی شاعری معائب سے خالی نہین، گو وہ خود تو یہ کہہ گیا ہے،

آج کس اہل سخن کو اس قدر مقدور ہے
کر سکے جو اے ظفر تیرے سخن پر اعتراض

تاہم جس نے بیس ہزار اشعار کہے ہون، ظاہر ہے کہ وہ سب اچھے نہ ہون گے، اس کے دیوان مین مبتذل اور ادنی درجہ کے اشعار ضرور ہین، خصوصاً جب وہ اپنے رنج والم اور اندوہ و غم کو بھول کر تفریح طبع کے لئے اشعار کہتا ہے، تو اکثر ان کا رنگ بہت ہی شوخ ہوجاتا ہی اور ان کے مضامین جرأت کی معاملہ بندی سے بھی گر جاتے ہین، یا جب وہ محض مشکل قوافی اور سنگلاخ زمینوں کی خاطر اشعار کہتا ہے، تو وہ بھی بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہین، اس کو احساس تھا کہ مشکل قوافی اور زمینون مین اعلیٰ معیار کا شعر کہنا مشکل ہے،

ظفر ہے تیری غزل کی وہ سنگلاخ زمین
کہ تیغ فکر سخنور کی دھار گر جائے،

پھر بھی صرف اپنی قادر الکلامی کے اظہار کیلئے غزلین لکھتا ہے، اور اپنی جدت اور ذہانت پر تعلی کرتا ہے،

جنھیں سخن کا ہے دعوی ذرا کھوان ہے
کہ ایسی جلد رقم تم کوئی غزل تو کرو

لیکن ظفر کے پورے دیوان پر خود اسی کا ایک شعر بہت ہی جامع تبصرہ ہو سکتا ہے،

شعر سادے اسکو ظفر اک اس مین کا اک ہمین کا
کوئی غزل پر اپنی جو نازان آگے تیری غزل کے ہو

یعنی ظفر خود اس کا خواہان تھا، کہ اس کے دیوان کا انتخاب ہو، مگر اسکو نہ خود اتنی فرصت نصیب ہوئی، اور نہ کوئی اس کا قدر دان پیدا ہوا، کہ میر اور غالب کی طرح اس کے دیوان سے بھی اچھے اور عمدہ اشعار منتخب کرکے ایک مجموعہ تیار کرتا، اب بھی اگر کسی صاحب ذوق کی کوشش سے اس کے دیوان کا انتخاب شائع ہوجائے تو یہ کہنے مین تامل نہ ہوگا، کہ

پروئے تو نے کیا تار سخن مین گوہر معنی
ظفر تحسین کنان محفل مین اب سارے سخندان ہین

اور شاید یہ بھی کہ

ترا سخن وہ مزے دار ہی کہ حشر تلک
رہین گے اسکے ظفر طبع نکتہ دان پہ مزے

ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی ایک تاریخی غلطی

از

جناب سید اسد انوری فریدآبادی بی ایس سی

ڈاکٹر بینی پرشاد کی انگریزی کتاب "ہسٹری آف جہانگیر" مطبوعہ ۱۹۲۲ء تاریخ اور سوانح کی ان چند کتابوں میں سے ہے، جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ہر طرح سے کامیاب ہیں، کیا بہ لحاظ واقعات کی صحت اور تکمیل اور کیا طرز بیان، ترتیب اور زبان، یہ کتاب صحیح معنوں میں اعلیٰ درجہ کی کتاب کہی جانے کی مستحق ہے، اسکی ایک معمولی سی غلطی کو ظاہر کرنے سے یہ مدعا ہر گز نہیں ہے، کہ اوسکی اہمیت میں کسی طرح کی بھی کمی کیجائے بلکہ یہ طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اتنی اچھی کتاب میں کوئی بھی نقص پایا جائے، اس کی بلند پایہ تحقیق ہی اسکی مقتضی ہے کہ ایک چھوٹی سی غلطی کا ازالہ بھی کر ہی دیا جائے۔

اکبر کے آخر وقت تاج و تخت کی وراثت کا جو جھگڑا پیدا ہو گیا تھا، وہ گو مشرقی درباروں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی لیکن اس حیثیت سے یہ نہایت اہم تھا، کہ ہندوستان کی مسلمان بادشاہی میں غالباً یہ پہلا موقع تھا، کہ وارث تخت و تاج کے انتخاب میں ہندو امرا بھی سازشوں میں شریک تھے، ایک طرف راجہ مان سنگھ کی قیادت میں زیادہ تر راجپوت اور مرزا عزیز کوکا اس کوشش میں تھے کہ خسرو کو تخت پر بٹھا دیا جائے، دوسری طرف چند دوسرے امرا تخت کے جائز وارث جہانگیر کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے، اکبر کے دربار میں راجپوتوں کا زور تھا، پھر خسرو سے ان کا صلبی تعلق اور ملک کی اکثریت کی ان کے ساتھ ہمدردی، یہ چیزیں جہانگیر کے لئے بہت یاس انگیز تھیں لیکن اس آڑے وقت میں شیخ فرید

سید مرتضیٰ خان بخاری جو اکبر کے عہد میں بعہدہ میر بخشی ممتاز تھے، جہانگیر کے کام آئے، ابھی اکبر کا انتقال بھی نہ ہوا تھا، کہ شیخ شاہزادہ سلیم کو اپنے گھر لے گئے، اور وہاں چند دیگر امرا، کی موجودگی میں جہانگیر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، شیخ کی موقع شناسی، سیاست، ہمت، اور سب سے زیادہ ان کی قابلِ احترام و ادب ذات، یہ جادو ایسا چلا کہ اس وقت کسی کو اختلاف و انحراف کی ہمت نہ ہوئی لیکن مخالف محاذیوں آسانی سے فتح ہو جانے والا بھی نہ تھا، خسرو آگرے سے نکل بھاگا، اور لاہور تک لوٹ مار کرتا ہوا جا پہنچا یہ وقت بھی جہانگیر پر کچھ کم سخت نہ تھا، دارالسلطنت میں بھی مخالفت کی آگ سلگ ہی رہی تھی، کہ یہ شعلہ بھڑک اٹھا، اس دفعہ بھی ہر پھر کر جہانگیر کی نظر شیخ فرید پہ ہی پڑی اور شیخ کو ایک دستے کے ساتھ خسرو کے تعاقب میں فوراً روانہ کیا، اور خود بھی پیچھے پیچھے ہو لیا، ادھر خسرو لاہور سے پلٹا، بھیروں وال کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی، میدان شیخ کے ہاتھ رہا، اور خسرو گرفتار ہوا، شام کو بادشاہ جہانگیر بھی آپہنچا، شیخ سے بغلگیر ہوا، اور شیخ ہی کے خیمہ میں رات گذاری یہاں تک تو سب مورخین کو اتفاق ہے، لیکن اس کے آگے ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب نے لکھا ہے:-

"اگر ایک طرف شاہنشاہ نے غداری اور بغاوت کی سزا میں سخت گیری کو روا رکھا، تو دوسری جانب نمک خواری اور وفاداری کا صلہ بھی بہت فراخدلی سے دیا گیا، شیخ فرید بخاری کو "مرتضیٰ خان" کے عالیشان خطاب سے نوازا گیا، اور مقام فتح یعنی بھیروں وال کا نام فریدآباد رکھ کر بطور جاگیر فاتح (شیخ فرید) کو بخشدیا"..... صفحہ ۱۵۰

حالانکہ واقعہ یہ ہے، کہ اس مقام (بھیروں وال) کا نام فتح کی خوشی میں فتح آباد رکھا گیا تھا نہ کہ فریدآباد،

نہ معلوم ڈاکٹر صاحب موصوف سے اس غلطی کا امکان کیسے ہوا، غالباً شیخ فرید کے نام کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے "فریدآباد" کا نام زیادہ قرین قیاس سمجھا لیکن تمام کتب تاریخ

سے بلا اختلاف یہ ثابت ہے، کہ اس جگہ کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا، کسی ایک بھی کتاب میں فرید آباد نہیں ہے، ہاں ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب شائع ہو جانے کے بعد سے بعض دوسرے مورخین نے بھی اس غلطی میں ان کی پیروی کی ہے، مثلاً

ھندرا کالج پٹیالہ کے پروفیسر بنرجی صاحب نے جو ڈی لیٹ (De laet) کی کتاب[1] پر نوٹ لکھے ہیں، اس میں انھوں نے دانستہ صحیح نام کو نظرانداز کر کے ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی پیروی میں اس جگہ کا نام فرید آباد لکھا، اسکی تفصیل آگے ملاحظہ فرمایئے،

پرانی تاریخی کتابوں میں یہ تذکرہ یوں ہے:-

۱- مآثر الامراء، نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان، حصہ دویم صفحہ ۶۳۷،

"ہمہ روز دو سہ ساعت از شب گذشتہ جنت مکانی برجناح استعجال رسیدہ شیخ را در آغوش گرفت و در خیمۂ او بیوتت فرمودہ آن مکان را (کہ از پرگنہ بھیرون وال بود) حسب الالتماس شیخ پرگنہ ساختہ بفتح آباد موسوم نمودہ بشیخ عنایت کرد و شیخ را بخطاب مرتضی خان و صاحب صوبگی گجرات بر نواخت"

۲- آئین اکبری، ترجمہ از بلوک مین، ۱۸۷۳ء اڈیشن،

"بھیروں وال کے پاس جنگ ہوئی، شام کو جہانگیر پہونچا، اور شیخ فرید کو گلے سے لگالیا، اور شیخ ہی کے خیمہ میں شب گذاری، اس ضلع کا نام پرگنہ فتح آباد رکھا گیا، اور شیخ فرید کو دے دیا گیا"۔

بھیروں وال پر بلوک مین نے فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:-

[1] The Empire of The Great Mogol از Delet
ترجمہ T. S. Hoyland حاشیہ از S. Bonnerjea مطبوعہ ۱۹۲۸ء

"بھیرون وال یا جواب بھیرو وال کے نام سے ہمارے نقشوں میں درج ہے، دریائے بیاس کے داہنے کنارہ پر اس سڑک پر واقع ہے، جو جالندھر سے امرتسر جاتی ہے"۔

۳- نامۂ مظفری، از منشی محمد ظفر حسین خان صاحب سلیمانی مطبع مجتبائی لکھنؤ صفحہ ۴۵۶،

"اس مقام مفتوح کو جو پرگنہ بھیرون وال مشہور تھا، شیخ کی حسب خواہش پرگنہ فتح آباد سے موسوم کیا"۔

۴- ڈی لیٹ (Delaet) متوفی ۱۶۴۹ء نے بھی اپنی کتاب میں ص ۱۹۵ پر یہی لکھا ہے:

"اس مقام کا نام فتح پور رکھا گیا"۔

ظاہر ہے کہ فتح پور سے مطلب فتح آباد سے ہے، کیونکہ اس سے تو ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کو بھی اختلاف نہیں کہ نام کا آخر جزو "آباد" تھا، نہ کہ "پور" لیکن اس کتاب کے محشی ڈاکٹر بنرجی نے اس پر نوٹ نمبر ۲، اس طرح لکھا ہے "فتح پور اس مقام کا نام بھیرون وال تھا، یہ شیخ فرید کو جو آئندہ مرتضیٰ خان کہلائے گئے، دیدیا گیا، شیخ فرید نے اس کا نام فرید آباد رکھا" ظاہر ہے کہ مسٹر بنرجی نے بغیر کوئی وجہ بتائے متن کتاب کے نام کو بدل کر ایک نیا نام اپنی طرف سے رکھدیا ہے، اگر مسٹر بنرجی کوشش بھی فرماتے تو سوائے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے ان کو کسی اور جگہ اس مقام کا یہ نام نہ ملتا،

اسی طرح اور کتابوں کے حوالے سے بھی یہ دکھایا جا سکتا ہے، کہ اس مقام کا نام فتح آباد ہی رکھا گیا تھا، ان صریح شہادتوں کے علاوہ قیاس بھی یہی چاہتا ہے، کہ اس جگہ کا نام کم از کم فرید آباد تو نہیں رکھا گیا ہوگا، کیونکہ شیخ نے اسی زمانے میں دلی کے قریب ۱۶ میل جانب جنوب ایک قصبہ فرید آباد بسایا تھا، جو اب تک آباد اور خوشحال ہے، یہ قصبہ ۱۰۱۴ھ میں آباد ہو چکا تھا، جیسا کہ وہاں کی جامع مسجد کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے:-

بعہد شاہ نور الدین جہانگیر　　شہنشاہ بدین و داد و احسان

اساس دین بنائے خیر بنہاد	فرید عصر و ملت مرتضےٰ خان
بعز و شوکت وجود و سخاوت	خلف ابن الخلف تا شاہ مردان
رقم خیر البقاع از خامہ ہوزد	پئے تاریخ این جاوید بنہاں

اور یہ قرین قیاس ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ ۱۰۱۴ھ میں تو شیخ فرید دلی کے قریب ایک قصبہ فریدآباد کے نام سے بساتے اور شروع ۱۰۱۵ھ میں وہ بھیروں وال کا نام بھی فریدآباد رکھتے یا رکھواتے کیونکہ خسرو ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ میں آگرہ سے بھاگا تھا، اور ۵۲ روز بعد شیخ نے اس کو بھیروں وال کے مقام پر قید کرلیا تھا،

اس میں شک نہیں کہ ۱۰۱۴ھ میں فریدآباد دلی کے پاس آباد ہو چکا تھا، خود جہانگیر جب خسرو کے تعاقب میں آگرہ سے شیخ فرید کے پیچھے پیچھے چلا ہے، تو راستہ میں دلی کے قریب فریدآباد میں جمعرات ۱۱ اپریل ۱۶۰۵ء کو قیام کیا، ڈی لیٹ نے بھی آگرہ سے لاہور کی منزلیں گنواتے وقت فریدآباد کے مقام کو دلی سے دس کوس جنوب میں بتایا ہے[۲] غرض یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ شیخ فرید نے بیک وقت دو قصبے فریدآباد کے نام کے بسائے، مختصر یہ ہے، کہ قیاس قرینہ، اور سب سے زیادہ صریح تاریخی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے، کہ خسرو کی گرفتاری کے بعد بھیروں وال کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا نہ کہ فریدآباد،

---

[۱] تزک جہانگیری ترجمہ بے درج صفحہ ۴۲، [۲] The empire of the great mogul صفحہ ۴۱،

رقعات عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم و ادب سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقایق کا انکشاف ہوتا ہے ضخامت، ۲۹۰ صفحات چھپائی لکھائی، کاغذ، بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب، قیمت: ...

"منیجر"

جاپان میں مسلمان

کو بے مسجد کو تسلیم کرانے کی کارروائی

از

پروفیسر برلاس دہلوی استاذ ہندستانی مدرسۃ السنہ خارجہ ٹوکیو (جاپان)

جاپان میں چھ سوسے اوپر مسلمان آباد ہیں جن میں آدھے تاتاری ہیں، جو انقلاب روس کے بعد وہاں سے ہجرت کرکے جاپان میں آباد ہوگئے ہیں، اگرچہ کثرت انہی کی ہے، مگر ان کے راستے میں بہت سی مشکلات حائل ہیں، ان کے لئے سب سے بڑی تکلیف کی بات یہ ہے کہ انھیں استقلال حاصل نہیں، ان کے پاس کسی ملک کا پاسپورٹ موجود نہیں، جس کی وجہ سے وہ حقوق شہریت کا مطالبہ نہیں کرسکتے، انھیں صرف یہاں رہنے کی رعایت حاصل ہے وہ کئی شہروں میں بسے ہوئے ہیں، اور چھوٹی موٹی تجارت کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی تعداد ٹوکیو، کوبے اور ناگویا میں ہے،

ان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا درجہ ہے، جو تعداد میں دو سو کے قریب ہیں، اور سب کوبے میں رہتے ہیں، گو یہ تاتاریوں سے کم ہیں، مگر حالت میں استقلال ہونے کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں، یہ سب تجارت میں مصروف ہیں، اور خوش حال ہیں، دوسری قوموں کے مسلمان سو سے کم ہوں گے، مگر ان میں سے ہر قوم کے افراد کی تعداد اتنی کم ہے، کہ ان کا کچھ اثر نہیں،

غیر مستقل حالت کے باوجود تاتاری دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ منظم ہیں، انھوں نے اپنی مادی اور روحانی ضروریات کی نگرانی کے لئے الگ الگ لیڈر بنا رکھے ہیں، جن کو سب تاتاری

مانتے ہین، انھون نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ٹوکیو میں مدرسہ قائم کرلیا ہے، اور دوسرے مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی مدارس میں بھیجتے ہیں، اور دینی تعلیم سے غافل ہیں، تاتاری جاہے جس شہر میں ہون، جہان وہ پانچ چھ بچے بھی جمع کرسکتے ہیں وہاں انھوں نے مدرسہ قائم کرلیا ہے، انھی مدارس کی عمارتوں میں وہ تہوار مناتے ہین، عیدین اور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، ایسے مواقع پر دوسری قوموں کے مسلمان جنمیں ہندوستانی بھی داخل ہین، ہمیشہ ان مدارس سے استفادہ کرتے ہین،

کوبے کی مسجد کی تعمیر دراصل ہندوستانی مسلمانون کی کوشش کا نتیجہ ہے، مگر انھوں نے صرف مسجد بنانے پر قناعت کی، اس میں اپنی قوم کا کوئی امام یا واعظ نہ رکھ سکے، جو اُن کو ان کی زبان میں دینی مسائل سمجھاتا، یا نیک و بد سے آگاہ کرتا رہتا، اور ان کے بچوّن کو دینی تعلیم دے سکتا، یہ سب کام تاتاری انجام دے رہے ہیں، مگر تاتاری امام اور معلمین تاتاری زبان بولتے ہیں، جو ہندوستانی مسلمان نہیں سمجھتے، تاتاری مسلمان اپنی روحانی ضروریات پوری کرنے کے لئے اتنا کچھ کر رہے ہیں، مگر انھیں جاپان میں مسجد بنانے کا خیال نہیں آیا،

جاپان میں سب سے پہلے مسجد بنانے کا سہرا ہندوستانی مسلمانوں کے سر ہے، جنھون نے دس برس پہلے اس کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا، اور تعمیر شروع کرنے کے بقدر روپیہ اکٹھا کرنے میں انھیں پانچ چھ برس لگے، تاتاری مسلمانوں نے بھی حتی المقدور چندہ دیا، دوسری قوموں کے مسلمانون سے بھی کچھ روپیہ وصول ہوا، مگر دراصل ہندوستانی مسلمانون کی ہمت سے یہ کام ہوا، کچھ روپیہ ہندوستان سے مسلمانون نے بھیجا بہت سا کوبے کے تاجرون نے دیا، یہ سب کچھ ہوا لیکن اگر جناب فیروز الدین صاحب دہلوی کا دستِ کرم شامل نہ ہوتا تو اتنی شاندار اور خوبصورت مسجد بننی مشکل تھی، کیونکہ نصف سے زیادہ رقم انھون نے ادا کی ہے، یہ مسجد ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی اور اسی زمانہ میں اسکی افتتاحی تقریب ہوئی،

مسجد بنانے کا ارادہ مستحکم ہونے کے بعد کوبے مسجد کمیٹی نے اسے مسلمانون کی عبادت گاہ تسلیم کرانے کی کارروائی شروع کردی، حکومت جاپان کے دستور العمل کی رو سے ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے، مگر پچاس برس ہوئے حکومت کی جانب سے ایک حکم نافذ ہوا تھا جسکی رو سے صرف تین مذہب یعنی شنتو، بدھ اور عیسائی تسلیم کئے جاتے ہیں، اگرچہ اور مذاہب کے پیروؤن کو اپنے طریقہ کے بموجب عبادت کرنیکی اجازت حاصل ہے، کوبے کے مقامی حکام نے تعمیر مسجد میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی، مگر اسے مسلمانون کی عبادت گاہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اس صورت میں مسجد کمیٹی والون کے لئے یہ راہ کھلی ہوئی تھی، کہ ٹیکس سے بچنے کے لئے عمارت کی رجسٹری بحیثیت ایک جلسہ گاہ کے کرا لیتے، مگر انھون نے بڑی سمجھداری سے کام لیا، اور اسے عبادتگاہ تسلیم کرانے پر مصر رہے،

چار سال ہوئے مسجد کے افتتاح کی تقریب کے موقع پر اراکین مسجد کمیٹی سے اس مسئلے پر گفتگو ردن کے سلسلے میں میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ توکیو جاکر بڑے بڑے لوگون اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدارون سے مل کر کوشش کرین، مگر ابھی ان کو کوبے میں کوشش کرنی باقی تھی، اس لئے انھون نے مجھ سے خواہش کی کہ توکیو آنے کے بجائے سفرائے دولِ اسلامیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے درخواست کیجائے، کہ وہ اسلام کی خدمت میں ہماری امداد کرین، میں نے اسکی تعمیل کی، میرے معروضہ پر سفرائے دول نے فرمایا کہ ہم امداد کرنے کے لئے آمادہ ہیں لیکن جب تک صحیح واقعات فراہم نہ کئے جائیں، ہم مداخلت نہیں کرسکتے، پچھلے سال مسجد کمیٹی نے میری تجویز پر کوبے میں اعلیٰ پیمانے پر جلسۂ میلاد النبی منعقد کرنے کا انتظام کیا تھا، اور اس میں بڑے بڑے لوگوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدارون کو شرکت کی دعوت دی تھی، اور مجھ ہی کو جلسے کی صدارت کیلئے مدعو کیا تھا، اس موقع پر میں نے پھر توکیو کی دعوت کا اعادہ کیا، مسجد کمیٹی والون نے توکیو میں کوشش کرنے کی معقولیت کو تسلیم کیا، مگر کاروبار سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے آیندہ پر ملتوی کردیا،

کوبے کے عہدیدار وقتاً فوقتاً ٹیکس کی ادائی کی یاد دہانی کرتے رہتے تھے، مگر کبھی تقاضے میں سختی نہیں کی، لیکن اس سال ان کے تقاضے نے بہت سخت لہجہ اختیار کر لیا، اور مسجد کمیٹی والے ٹوکیو میں کارروائی کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنے پر مجبور ہوگئے، انھوں نے مجھے وفد میں شریک ہونے کی دعوت دی، اور اس کی سرپرستی کرنے کی خواہش کی، اور ٹوکیو کا تمام کام میرے سر ڈال دیا کہ میں ہی سفرائے دول اسلامیہ کی خدمت میں وفد کی باریابی کا انتظام کرکے وقتِ ملاقات طے کروں، میں ہی بڑے بڑے لوگوں سے ملانے کی کوشش کروں، اور میں ہی اعلیٰ عہدیداروں کی خدمت میں رسائی کا انتظام کروں، اس کے لئے فرصت اور تندہی دونوں کی ضرورت تھی، خوش قسمتی کہ بہار کی تعطیل تھی، اس لئے میں کوبے مسجد کمیٹی کو پورا ایک مہینہ دے سکا، اگرچہ اس خدمت پر مجھے اپنا مطالعہ اور تحریری کام قربان کرنا پڑا، یہ کام توقع سے زیادہ سخت ثابت ہوا، اور مجھے آرام کرنے کی غرض سے ہفتہ عشرہ کے لئے ٹوکیو کے باہر جانا پڑا،

کوبے مسجد کمیٹی کے وفد کو شرفِ باریابی بخشنے سے پہلے سفرائے دولِ اسلامیہ یہ جاننا چاہتے تھے، کہ اس مسئلہ میں ان کی مداخلت ضروری ہے بھی یا نہیں، اسلئے ان کو اس کی اہمیت جتانی ضروری تھی، چنانچہ بعض سفارت خانوں میں مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی، وفد کو اس بات پر بجا طور سے فخر ہے، کہ ہز ایکسیلنسی خسرو گیرید سفیر دولت ترکی نے شرف باریابی بخشا، اور امداد کا وعدہ فرمایا، ہز ایکسیلنسی عبدالوہاب داؤد بے سفیر دولت ترکی اور ہز ایکسیلنسی حبیب اللہ خان طرزی سفیر دولت افغانستان نے نہایت مہربانی سے وفد سے وعدہ فرمایا، کہ ہم حتی الامکان امداد کریں گے، ہز ایکسیلنسی علی محمد شیبانی قائم مقام سفیر دولت ایران بڑے جوشیلے مسلمان ہیں، اگرچہ وہ بوجوہ چند در چند ٹوکیو میں تشریف نہ رکھتے تھے، اور وفد کو شرف باریابی نہ بخش سکے، تاہم انھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا، کہ میں حتی الامکان کوشش کرونگا،

مجھے چند بااثر جاپانی حضرات کی امداد حاصل کرنے میں بھی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، یہ حضرات اسلامی ملکوں کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور اعلیٰ حلقوں میں ان کی رسائی ہے، ان کو مسلمانوں کی مشکلات کا احساس ہے، انھوں نے ہمیں یقین دلایا، کہ ہم مسجد کا ٹیکس معاف کرانے اور جاپان میں اسلام کو مذہب تسلیم کرانے کی کوشش کریں گے، بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ ان حضرات سے مسجد کمیٹی کا تعارف کرانا درحقیقت مفید ہوا،

میں نے جناب ماتسوُو صاحب کا محکمۂ امور مذہبی کے ڈائرکٹر ہیں جو وزیرِ تعلیم کے ماتحت ان معاملات میں حکم کا درجہ رکھتے ہیں، ملاقات کا انتظام کیا تھا، میں جناب توزاوا صاحب ڈائرکٹر مدرسۃ السنۂ خارجہ کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً کوبے مسجد کے معاملات میں میری بہت اعانت فرمائی، اور جناب ماتسوُو صاحب سے ملاقات کا انتظام کرنے میں کافی کوشش فرمائی صاحب موصوف نے وفد کی معروضات بڑی خندہ پیشانی سے سماعت فرمائیں، اور اس ملاقات کی خاطر اوقاتِ دفتر کے بعد بڑی دیر تک ٹھہرے رہے، اگرچہ اس ملاقات کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، تاہم صاحب موصوف نے ہمیں یقین دلایا، کہ حکومت اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی ہے، اسلام کوئی اکیلا مذہب نہیں ہے، جو باضابطہ تسلیم کئے جانے سے محروم ہے، بلکہ جاپان میں اور مذاہب بھی ہیں، جو تسلیم کے لئے درخواست کر رہے ہیں، حکومت جملہ معاملات پر وسیع نقطۂ نظر سے غور کر رہی ہے، اور ایک قانون مرتب کرنے میں مصروف ہے، جس سے تمام مشکلات حل ہوجائیں گی، سردست دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر ایک مذہب کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا، صاحب موصوف نے ہمیں یہ بھی بتایا، کہ چند روز ہوئے، اسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے برطانوی سفارت خانے سے ایک سکریٹری صاحب تشریف لائے تھے،

کوبے مسجد کمیٹی مستحقِ مبارکباد ہے، کہ اس کے وفد نے ٹوکیو میں تین دن کے اندر اس قدر

کام انجام دے لیا، اگر مسجد کمیٹی کو معقول رہنمائی حاصل ہوتی، تو اس میں شک نہیں، کہ اس سے زیادہ کام اور اس سے بہتر طریقے سے انجام پا سکتا تھا، افسوس ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس کے مشوروں میں دخل حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے فیصلوں میں تنگ نظری کا غلبہ ہے، ٹوکیو میں وفد کا جملہ کام تین دن میں ختم ہوگیا، مگر کوبے میں جو تیاری دفتر میں بیٹھ کر کی جا سکتی تھی، وہ مکمل نہ ہوسکی، باوجود میری یاددہانی کے کوئی تحریری یادداشت مرتب نہیں کی گئی تھی، سفرائے مسلم دول کے یہاں تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا، کیونکہ بہت سی باتیں میری سابقہ ملاقاتوں اور مراسلات میں واضح ہو چکی تھیں، مگر جناب ڈائرکٹر صاحب محکمۂ امور مذہبی کی ملاقات کے وقت ایک تحریری یادداشت پیش کرنی نہایت ضروری تھی،

وفد مرتب کرنے میں مسجد کمیٹی سے ایک سخت غلطی ہوئی، وہ یہ کہ وفد کے جملہ اراکین ہندوستانی مسلمان منتخب کئے گئے اور دوسری ممالک کے مسلمانوں کو رکنیت سے خارج رکھا گیا، پانچ اراکین میں سے کم از کم دو غیر ہندوستانی مسلمان ہونے چاہئیں تھے، تاکہ اسے عالم اسلامی کی نمائندگی حاصل ہوتی، اس غلطی کی وجہ سے ایک اور غلطی یہ ہوئی، جسے غلط حکمتِ عملی کہا جا سکتا ہے، کہ وفد کی اس منزل میں سفیر برطانیہ کی خدمت میں سفارش کی درخواست لیکر جانا کوئی دانشمندی کی بات نہ تھی، اس کے لئے بہترین طریقہ یہ تھا، کہ اس معاملہ کو کلیۃً اہلِ جاپان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاتا، اور جب تک اعلیٰ حکام انکاری جواب نہ دیدیتے، اسوقت تک غیر مسلم دول کے سفراء کو تکلیف نہ دی جاتی، شاید جناب مانسوؔ صاحب کو برطانوی مداخلت ناگوار گذری کہ انھوں نے صاف جواب دیدیا، جو جاپانی دستور کے خلاف ہے،

تاہم ہم لوگ ہز ایکسیلنسی سر رابرٹ کریگی صاحب سفیر برطانیہ کے نہایت ممنون ہیں، کہ آنجناب نے ہمارے وفد کو شرفِ باریابی بخش کر مسلمانوں کے معاملات میں اس قدر دلچسپی کا اظہار فرمایا، اور بڑی گرمجوشی سے مسجد کے معاملے کو ہاتھ میں لیکر وزیر خارجہ کی توجہ اسکی جانب منعطف فرمائی، مگر ہمیں اس بات کا سخت رنج ہے کہ آنجناب کو وزارتِ خارجہ سے مایوسانہ جواب ملا،

ہم نے کتنی ہی غلطیاں کی ہوں، اور کیسی ہی غلط حکمت عملی برتی ہو، مگر یہ بڑی خوشی کا مقام ہے، کہ وفد کی سعی انجام کار مشکور ہوئی، مارچ کے آخری ہفتے ہی میں بادِ مخالف کا رُخ بدل گیا، اور کوبے کے مقامی حکام کے طرز عمل میں ہمدردانہ انداز نظر آنے لگے، وہ اب اس کوشش میں سرگرداں ہیں، کہ مسجد کمیٹی کا بار ہلکا کرنے کی کیا تدبیر کی جائے، یقین ہے کہ حل بھی نکل آئے گا، ہم حکومت کے مراحم کے نہایت شکر گذار ہیں،

تلخیص و تبصرہ

تاریخ ہند کی کانگریس کا دوسرا اجلاس

اس کانگریس کا دوسرا اجلاس ۸ و ۹ اکتوبر کو الہ آباد میں بڑی عمدگی اور خوش نظمی کے ساتھ منعقد ہوا، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نمایندوں کے علاوہ دیگر اصحاب جنھیں تاریخ سے دلچسپی ہے، مختلف مقامات سے آئے تھے، جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بیان کی گئی ہے، جلسہ سے ایک روز قبل، ۷ تاریخ کو نواح الہ آباد کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے لاریوں اور موٹروں میں نمائندوں کے لیجانے کا انتظام تھا، چنانچہ وہ دن اسی میں صرف ہوا، اسی روز شام کو خان بہادر سید ابو محمد صاحب کی صدارت میں رائے بہادر بریاگ دیال نے ایک مضمون ان سکوں پر پڑھا جو حال میں اودھ میں دستیاب ہوئے، مغرب کے بعد مسٹر رامچندر منچنڈا نے میجک لینٹرن کے ذریعہ سے لاہور کے شالامار کی عمارات اور باغ کا مظاہرہ کیا، اور لفظ شالامار کی تحقیق پر ایک مفصل لکچر دیا،

۸ اکتوبر کی صبح کو آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم نے نمایش کا افتتاح کیا، اس نمایش میں سکہ جات، فرامین شاہی، اور قدیم ایام کی تاریخی تصاویر مختلف کمروں میں بڑی خوبی سے مرتب کی گئی تھیں، یہ نمایش رائے بہادر پنڈت برج موہن ویاس نے بڑی محنت سے مرتب کی تھی، اُسی روز سہ پہر کے وقت ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب بنارس نے ہسٹری کانگریس کا افتتاح سینٹ ہال میں کیا، اس کے بعد سر ڈگبی ڈریک برکمین صاحب چیرمین پبلک سروس کمیشن و صدر استقبالیہ ہسٹری کانگریس نے خطبہ استقبالیہ پڑھا، پھر ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ بھنڈرکا نے اپنا عالمانہ خطبہ صدارت پڑھا، انھوں نے اس میں ہندوستان کی قدیم تاریخ پر بحث کی، اور خطبہ کے خاتمہ پر ڈاکٹر سر شفاعت احمد خان صاحب کی اس تجویز کا تذکرہ کیا، کہ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ لکھی جائے، اور اس بات پر زور دیا، کہ اس اجلاس میں اس مسئلہ کا فیصلہ کیا جائے،

اُسی روز شام کو دو شعبہ جات کے اجلاس ہوئے، ایک آثار قدیمہ بصدارت رائے بہادر کے این، ڈکسٹ، اس میں سب سے اول خان بہادر مولوی ظفر حسن سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ نے ملا اقبال خان کے ایک کتبہ پر مضمون پڑھا، جو موضع کھیرا متصل دہلی کی ایک قدیم عیدگاہ میں لگا ہے، اور جس کی تاریخ تحریر ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۶ء ہے، ملا اقبال خان محمود شاہ تغلق کے عہد میں گویا کہ سلطنت کا مالک تھا، اس کتبہ میں مغلوں کے حملے اور دہلی کی بربادی کے حالات مفصل درج ہیں، اس کے بعد متعدد مضامین پڑھے گئے،

اسی وقت دوسرے کمرہ میں ماڈرن (زمانہ حال کی) تاریخ کا اجلاس بصدارت ڈاکٹر بال کرشنا پرنسپل راجہ رام کالج کولاپور منعقد ہوا، خطبۂ صدارت کے بعد موصوف نے ایک مضمون پڑھا، جس میں واقعات سے ثابت کیا، کہ "ہندوستان میں انگریزوں کی فتح اتفاقی نہ تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد صرف تجارت نہ تھا، بلکہ ابتدا ہی سے تجارت کے ساتھ ملک گیری مدنظر تھی" اس کے بعد سری نواس اچاریہ پروفیسر یونیورسٹی انا ملائی، کا مضمون "کرناٹک اور نصیر جنگ" پر ہوا، پھر ڈاکٹر کرشنا سنہا لکچرر کلکتہ یونیورسٹی کا مضمون "حیدر علی کے تعلقات حکومت برطانیہ کے ساتھ" پر ہوا، جس میں موصوف نے حیدر علی کے خلاف خوب زہر اُگلا، اور بیان کیا کہ اگرچہ وہ میسور کا نجات دہندہ تھا، مگر اُس نے نوجوان راجہ کو قید میں رکھا تھا حتی کہ اُسے زہر دے کر مار ڈالا اس کے ذاتی کیرکٹر کی نسبت

کہا کہ وہ لڑکیوں کو مار ڈالتا تھا، اور اُس نے چار ہزار عورتوں سے شادی کی تھی، مگر بعد کے ایک ہندو لکچرر سے جب سوال کیا گیا، تو اُس نے صاف الفاظ میں کہا کہ حیدر علی کی بیویوں کی نسبت جو کہا گیا ہے، اُس میں بہت مبالغہ ہے،

اس کے بعد ڈاکٹر کالی کنکر دت نے ورلب رام نائب سراج الدولہ کی نسبت جو مضمون پڑھا، اُس مین صاف الفاظ میں کہا کہ اُس نے مثل میر جعفر کے سراج الدولہ کے ساتھ نمک حرامی کی،

مسٹر جگدیش نرائن سرکار، پٹنہ کالج نے اپنے مضمون مین "سترہوین صدی مین شورے کی تجارت میں انگریزون کی مداخلت کے حالات بیان کئے، ڈاکٹر اے، ایل سری واستو ڈونگر کالج بیکانیر نے ۱۷۶۵ء کے صلحنامہ واقع الہ آباد پر مضمون پڑھا، جو انگریزون اور شاہ عالم کے درمیان ہوا تھا، اُس میں انگریزوں کی برتری کو تسلیم کرکے دکھایا، کہ واقعی اہل ہند کمزور تھے، اور اس میں انگریزون نے اپنے مخالفین کے ساتھ مراعات کی تھیں، اودھ کی نسبت بتایا کہ وہ آخر تک کمپنی کا وفادار رہا،

اسی شعبہ مین دوسرے روز ڈاکٹر پی باسو لکھنؤ نے حکومت اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالی تعلقات پر مضمون پڑھا، جس میں دکھایا کہ انگریزون نے بنگال کے روپیہ سے جنوبی ہند مین کام کیا، اور اُسی روپیہ کے دباؤ میں نظام کے ساتھ مساویانہ صلح کی، اور انگریزون کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مرہٹون میں باہمی رقابت تھی، خلاصہ یہ کہ خود ہندوستان کے آدمیون اور روپیہ سے ہندوستان فتح ہوا،

اُسی وقت "ہندوستان کی قدیم تاریخ" کا اجلاس بصدارت دیوان بہادر ڈاکٹر کرشنا سوامی آئنگر ہوا، جس میں (۱۹) مضامین تھے، ان میں سے بہت سے پڑھے گئے،

لکچروں کے اختتام پر رات کو ایک مقامی ہندو رئیس کی طرف سے مہمانوں کا ڈنر ہوا، پھر دوسرے روز ۹ اکتوبر کو ایک وقت میں تین اجلاس ہوئے،

۱- باقی ماندہ قدیم تاریخ کے مضامین،

۲- مرہٹوں کی تاریخ کا شعبہ بصدارت پروفیسر وتوامن پوتدار جس میں سات مضامین تھے،

۳- سکھوں کی تاریخ کا شعبہ بصدارت پرنسپل سیتارام کوہلی جس میں چار مضامین تھے، مسلمانوں اور سکھوں کا چونکہ مقابلہ رہا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان میں مسلمانوں کی زیادتیاں نمایاں کی گئیں،

ایک بجے سے ۴ بجے سہ پہر تک "شعبۂ سلطنت" کا اجلاس بصدارت پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی منعقد ہوا، جس میں دس مضامین تھے، ان میں سے خاص مضامین فیروز شاہ تغلق، محمد بختیار خلجی، سفرنامہ ابن بطوطہ، فیروز شاہ بہمنی پر تھے، صاحب صدر نے شروع اجلاس میں یہ فرمایا تھا، کہ بجائے کل مضمون پڑھنے کے ان کی خصوصیات بیان کردی جائیں، اور ان پر سوالات ہوں، اس کی وجہ سے اس شعبہ میں عالمانہ بحثیں ہوئین، اور پروفیسر حبیب صاحب کی ظرافت اور خوش بیانی کی وجہ سے یہ اجلاس پر لطف رہا،

اُسی وقت دوسرے کمرہ میں "شعبۂ تاریخ راجپوت" کا اجلاس بصدارت ڈاکٹر سرنیدرانا تھ سین منعقد ہوا، جس مین سولہ مضامین تھے، ان اجلاسون کے بعد ۴ بجے شام کے مہمانوں کا ایٹ ہوم ہوا، پھر رات میں راؤ صاحب سری نواس اچاری کا ایک لکچر "جنوبی ہند کی تاریخ" پر ہوا، اس کے بعد راؤ بہادر کے این ڈکسٹ ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ کا لکچر میجک لینٹرن کی امداد سے ہوا، اور سب سے آخر میں خواجہ محمد احمد صاحب مہتمم عجائب خانہ حیدرآباد دکن کا لکچر میجک لنٹرن کے ذریعہ مسکی کے بارہ میں ہوا،

۱۰ اکتوبر کو جو آخری دن تھا، صبح کے وقت "مغل تاریخ" کا شعبہ بصدارت مسٹر آر۔ پی، کھوسلا منعقد ہوا، جس میں دس مضامین تھے، اس کا پہلا مضمون "اورنگزیب اور شہزادہ محمد اکبر کی خط وکتابت"